رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور بزرگ خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۹۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا، توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۶۲۳ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنہ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کیے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھرے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے دفع کی کتنی تدبیریں کیں۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

یت ضروری اطلاع اگر کسی مہینہ کا پرچہ ۱۵ر تک نہ پہونچے تو ہمیں لکھ بھیجئے تاکہ ہیڈ [illegible] آپ کو
پرچہ دوبارہ روانہ کر دیا جائے، ورنہ پھر پرچہ بیرنگ روانہ کیا جائے گا منیجر

“نگار” کا آئندہ سالنامہ

مئی اور جون کے “نگار” میں ہم کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ نگار کا آئندہ سالنامہ

“فرمانروایان اسلام” نمبر کیا، اور کیسا ہوگا

اس کی بعض خصوصیات کو بھی ظاہر کر چکے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے بعض حضرات اس کی اہمیت کا نہ کر سکے ہوں، ہم مکرر اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں ۔

یہ سالنامہ در اصل “تاریخ اسلامی” کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادت رسول اللہ سے لیکر اس وقت تک کی تمام بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہو کر فنا ہو گئیں یا اب بھی باقی اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ تمام حکمرانوں کے نام حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاند ہوئے انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یوروپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے “تاریخ اسلام” میں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھ کر توں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری ۱۹۵۳ء تک اسے شایع کر سکیں گے ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم کچھ کہہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع ت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی متوجہ کریں

یہ سالنامہ در اصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصول ڈاک) تین روپے ہوگی۔

ایجنٹوں کو اپنا آرڈر جلد دیدینا چاہئے تاکہ اسی حساب سے اسکی کاپیاں زاید طبع کرائی جائیں

سالنامہ کی کتابت شروع ہو گئی ہے اور ۲ر جنوری ۵۳ء کو شایع ہو جائے گا۔

حضرات مطلع فرمائیں کہ انھیں سالنامہ کی کتنی کاپیاں درکار ہوں گی ۔ قیمت تین روپیہ فی کاپی (علاوہ محصول) ں سے دو روپیہ فی کاپی مع محصول ۔

منیجر نگار لکھنؤ

نگار

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ ستمبر میں ختم ہوگیا اور اکتوبر کا "نگار" آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۴ | فہرست مضامین ستمبر ۱۹۵۳ء | شمار

ملاحظات - - - - - - - - - ۲
مومن کا تغزل - - - - - - نظیر صدیقی ۶
حقیقت وفات حضرت عیسیٰ بن مریم - - محمد اجمل خاں (دہلی) ۱۴
فن تحریر کی تاریخ - - - محمد اسحاق صدیقی ۲۴
صحرا کا موتی - - - - - "ق" ۳۶
موجودہ ہندی اور اُسکی نئی اصطلاحات - محمود علی خاں - - -
گاہے گاہے باز خواں - - - - - - - - -
جنگ اور جاسوسی - - - - - - - - - -
منظومات - - ساقی، مانی، وجد، فضا، آزاد - - - -
- - - - - - - - - - -

پیاری بیٹی شوکت

تم کو کیا خبر، لیکن ۱۵ر جون سنہ ۳۵ء کی رات مجھے یاد ہے جب تم پیدا ہوئیں - میں بہت خوش تھا اور اولاد
پیدا ہونے سے کون خوش نہیں ہوتا، لیکن تمہارے ساتھ میرا لگاؤ اس لئے اور زیادہ ہوگیا کہ تمہارے پیدا ہون
بعد تمہاری ماں جو مجھے بہت زیادہ عزیز تھیں علیل ہوگئیں اور تمہاری پرورش کا زیادہ تر بار مجھی کو اُٹھانا پڑا، گ
تمہارے لئے ایک ماں کے فرائض بھی کئی سال تک مجھے ادا کرنے پڑے

تمہارے پیدا ہونے کے دو سال بعد جب میں بھوپال سے لکھنؤ آیا تو تمہاری ماں صحت یاب ہوچکی تھیں
تم آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہی تھیں

تم صرف میری اور ماں ہی کی محبوب بیٹی نہ تھیں بلکہ تمہارے نانا، نانی، خالائیں، ماموں اور تمام اعزہ
بہت چاہتے تھے

زمانہ گزرتا گیا اور تم نشو و نما پاتی رہیں اور چونکہ تم اپنی ماں کی تنہا اولاد تھیں، اس لئے تمہاری کوئی خوا
ایسی نہ تھی جسے پورا نہ کیا گیا ہو

جب تمہارا توتلانا کچھ کم ہوا تو تمہاری تعلیم کی طرف توجہ ہوئی اور میری خوشی کی انتہا نہ تھی جب تم نے د
کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر تم انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں بیٹھیں

اس کے بعد تمہارا سلسلۂ تعلیم ختم ہوا، کیونکہ تمہاری ماں تمہاری شادی جلد کر دینا چاہتی تھیں ۔ اور آخر کار سنہ ۳۱ء میں مجدد نیازی سے (جس کا نشو و نما بھی تمہارے ہی ساتھ ہوا تھا اور مجھے تم سے کم عزیز نہ تھا) تمہارا کر دیا گیا

سنہ ۳۲ء میں جب تمہارا پہلا بچّہ (جاوید) پیدا ہوا تو تمہاری ماں کی خوشی کا جو عالم تھا اسے الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا، اس بچّے کو تم نے نہیں بلکہ تمہاری ماں نے پالا اور تم پر یہ بار نہیں ڈالا۔ اس کے بعد ۵ سال ہنسی گزر گئے اور دفعتًا تمہاری ماں بیمار پڑیں اور آٹھ مہینے علیل رہ کر چل بسیں۔ زندگی میں یہ پہلا غم تھا جو تم کو تا پڑا لیکن اس کے بعد تمہارے دو بچّے اور پیدا ہوئے (جواد ۔ فرحت) اور تم بہل گئیں

اس کو بھی ۵ سال گزر گئے اور ہر چند تمہاری ماں کی جدائی نے میری کمر توڑ دی تھی، مینے تمہیں کبھی یہ محسوس نے دیا کہ تمہاری زندگی میں کوئی خلا پیدا ہو گیا ہے اور تم کو خوش رکھنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو پیرانہ سالی میں ہو سکتا تھا

اب میری صحت گرتی جا رہی تھی اور وہ زمانہ قریب تر آتا جا رہا تھا جب میں تمہیں اور تمہاری اولاد سے ہمیشہ لئے رخصت ہوتا ۔۔۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ دفعتًا ۲۰ اگست کو (ٹھیک وہی مہینہ ہی تاریخ جب ۵ سال قبل تمہاری ماں کا انتقال ہوا تھا) تم بیمار ہوئیں اور دو دن کے اندر میری زندگی کا ی ورق الٹ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں

ایک وقت تھا جب میں نے تمہارے سر پہ سہرا باندھا تھا اور آج بارہ سال کے بعد تم کو کفن پہنا کر پہلی اور ی بار گھر سے رخصت کر رہا ہوں ۔۔۔ شادی کے بعد رخصتی کی رسم ادا ہوا کرتی ہے، لیکن کبھی کبھی یہ رسم اس طرح پوری کی جاتی ہے، مجھے معلوم نہ تھا

خیر، اس زخم کے مندمل ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ مجھے اب کتنے دن جینا ہے کہ تمہاری یاد دل سے نے کا خیال دل میں آئے، اور یوں بھی ممکن نہیں، کیونکہ گھر کے در و دیوار، گھر کی ایک ایک چیز، گھر کا ہر ہر تمہیں پکار رہا ہے اور ذرا سی آہٹ سے بھی میں چونک پڑتا ہوں کہ یہ تمہارے قدموں کی آواز تو نہیں، وہ میرے ساتھ تمہاری سمندر کی سی گہرائی رکھنے والی خاموش محبّت، جس کے سہارے میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا اب کہاں ! ۔۔۔ اچھا ہوا تنکا بھی تم اپنے ساتھ لے گئیں ۔۔۔ ڈوبنا ہے تو دیر ہو ؟ ۔۔۔ لیکن ہاں یہ تو بتاؤ کہ یہ جو ہر طرف سے "شوکت، شوکت" کی آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے یونکر روکوں ۔ اور بے اختیارانہ تمہارا نام میری زبان سے نکل جاتا ہے تو تم "جی ابا" کہکر کیوں فورًا ب دیدیتی ہو ۔۔۔ تم تو بہت آہستہ بولنے کی عادی تھیں اور اب اتنی دور سے بھی تمہاری آواز میرے ں تک پہونچ جاتی ہے، شاید اس لئے کہ میں یہ نہ سمجھوں تم مجھ سے جدا ہو گئی ہو

یقینًا اس وقت جبکہ میری عمر ستر سال یا اس کے قریب قریب پہونچ چکی ہے ایسا صدمہ مشکل ہی سے برداشت سکتا ہے، لیکن میں اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ میں زندگی کے باقی دن تمہارے بچّوں کی خدمت صرف کر دوں اور جب تمہاری چھوٹی بچّی فرحت کو اپنی گود میں لوں تو یہ سمجھوں کہ تمہیں میری گود میں ہو ۔ وہ کھیل جو میں نے ۲۸ سال پہلے تمہارے ساتھ کھیلا تھا، اب پھر کھیلنا چاہتا ہوں ۔۔۔ تم نہ سہی ری بچّی سہی، ایک ہی بات ہے

اولاد کی موت کا صدمہ بڑا سخت صدمہ ہے، لیکن کوئی نہ کوئی پہلو تسکین کا نکل ہی آتا ہے۔ سوچتا کہ دوچار سال بعد آخرکار تم کو میری موت کا غم اُٹھانا ہی تھا اور وہ تمھارے لئے یقیناً ناقابل برداش ہوتا، اس لئے مجھے یک گونہ تسکین ہو جاتی ہے اس خیال سے کہ تم مجھ سے پہلے رخصت ہو کر اس صدمہ سے مح رہیں اور تمھارا سارا غم خود میں نے اپنے سر لے لیا

اب تم جس دُنیا میں ہو، وہاں کا حال کسی کو معلوم نہیں، لیکن غالباً وہاں کی آبادی اتنی خود غرض، ا بے رحم نہ ہوگی جس قدر یہاں کی ہے اور پھر تم تو کس قدر معصوم تھیں، کتنی نیک تھیں، تم کو تو جوار رحمت م جگہ ملی ہوگی اور تم وہیں سے اپنے غمزدہ باپ، اپنے سوگوار شوہر، اپنے معصوم بچّوں، اپنی چاہنے والی خا اور اپنے چھوٹے بھائیوں کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوگی

اچھا، تم سے کافی باتیں ہو چکیں۔ اب اجازت دو کہ کچھ دیر کے لئے آنسو خشک کر لوں

خدا تمھیں اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے

گھبراؤ نہیں میں بھی بہت جلد تمھارے پاس آنے والا ہوں۔ صرف اتنے دنوں کی مہلت چاہتا ہو تمھاری چھوٹی بچی فرحت تمھیں بھول جائے اور ہر شخص سے بار بار یہ پوچھنا چھوڑ دے کہ "باجی کہاں ہی کب آئیں گی"۔

تمھارا غمزدہ باپ
نیاز

ملاحظات

کشمیر کی نہ سلجھنے والی گتھی

اس مہینے کا اہم ترین واقعہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے لئے نہرو، محمد علی کی ملاقاتیں تھ جو کراچی اور دہلی میں ان دونوں کے درمیان ہوئیں، گو نہرو کا کراچی جانا اور اس کے بعد دہلی آ ان میں سے ہر ایک بہ لحاظ حالات مختلف نوعیت رکھتا تھا، لیکن مقصد بہر نوع دونوں کا ایک تھا۔ جس وقت نہرو کراچی گئے اس و کشمیر کی وزارت میں انقلاب نہ ہوا تھا لیکن ان کی واپسی پر شیخ عبداللہ معزول ہو گئے اور بعض اخباروں نے یہ خبر شایع کر دی کہ کشمیر کے انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے ہندوستانی فوجوں سے بھی مدد لی گئی تھی تو پاکستان میں اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ وہاں کی بعض جماعتوں میں بچ گئی اور اسے ہندوستان کا ناروا اقدام قرار دیکر جہاد کی تبلیغ شروع کر دی جس میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ مس فاطمہ جناح نے اور غالباً اس لئے کہ ان کی زندگی میں سب سے پہلا (اور غالباً سب سے آخری) موقع یہی ایسا تھا کہ وہ پبلک میں آکر اپنی پچھلی ۶ سال کی کس مپرسی ونا کا انتقام حکومت سے لے سکتیں۔ کشمیر کے انقلاب وزارت کی وجہ سے جو ہیجان پاکستان میں پیدا ہوا، اس سے محمد علی کو یقیناً پریشان چاہئے تھا، کیونکہ چند دن قبل ہی نہرو کراچی آکر بڑی خوشگوار و امید افزا فضا پیدا کر گئے تھے اور اس کے بعد فضا کا یہ تکدر یقیناً تشویش کی بات

محمد علی نے اس میں شک نہیں کہ بڑی دانشمندی سے کام لیا اور نہرو سے جلد از جلد بالمشافہ گفتگو کرنا ضروری سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو جس حد تک عوام کے جذبات کا تعلق ہے، دونوں ملکوں میں اتحاد و یگانگت کی راہ زیادہ واضح ہو گئی اور محمد علی اپنی جگہ کافی اطمینان لیکر کرا واپس گئے۔ لیکن ان کو ابھی ایک اور کٹھن منزل طے کرنا تھی، یعنی واپس جاکر پاکستانی کابینہ اور وہاں کے عوام کو مطمئن کرنا، اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ــ یہ تو خیر وہ ابتدائی مرحلے تھے جن کا سب سے پہلے طے ہو جانا ضروری تھا بھی اور ایک حد تک طے ہو بھی گئے

غور طلب امر یہ ہے کہ کشمیر میں رائے شماری کے بنیادی اصول پر عمل کرنے کی وہ کونسی صورت ہو سکتی ہے جو پاکستان و ہندوستان دونوں کو مطمئن کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ کشمیر کے حالات میں بعض ایسی تبدیلیاں ضرور ہوئی ہیں، جنھوں نے معاملہ کو سلجھانے کے بجائے اور اُلجھا دیا ہے اور اس کی ذمہ داری نہ عبداللہ گورنمنٹ پر ہے، نہ کشمیری مسلمانوں پر بلکہ ہندوؤں کے اس طبقہ پر جو ہندوستان میں بھی انتشار و تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے اور کشمیر میں بھی — جن سنگھیوں نے جس نہج سے کشمیر کے مسئلہ کو ہاتھ میں لیا وہ بڑا غلط طریقہ تھا، انھوں نے کشمیریوں کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان میں بددلی و بدگمانی پیدا کر کے وہاں کے مسلمانوں کو یہ سمجھنے کا موقع دیا کہ ہندو قوم کبھی ان کے ساتھ رواداری و مسالمت کا سلوک نہیں کر سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود عبداللہ کے دل میں بھی شک و شبہ پیدا ہونے لگا، ایک جماعت پاکستان کی حمایت کرنے والی اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس موقع سے بعض غیر ملکی افراد نے بھی فائدہ اُٹھا کر کشمیریوں میں ایک آزاد حکومت کا تصور پیدا کرنا شروع کیا۔ پھر یہ تو ضرور ہوا کہ عبداللہ کو معزول کر کے انھوں نے ایک ایسے شخص کی قوت توڑ دی جسے وہ آزاد کشمیر کا حامی سمجھتے تھے، اسی کے ساتھ غیر ملکی افراد کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کر کے بیرونی مداخلت کے امکان کو بھی ضعیف کر دیا گیا اور بخشی کی نئی حکومت نے بھی بعض اقتصادی اصلاحات کا اعلان کر کے کشمیر کے فاقہ کش مسلمانوں میں اطمینان کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اب ہندوستان کے لئے راہ بالکل صاف ہو گئی ہے، غالباً درست نہیں کیونکہ باوجود اس یقین کے کہ کشمیر ہندوستان ہی کے ساتھ رہ کر ترقی کر سکتا ہے، باوجود اس علم کے کہ پاکستان کشمیر کی اقتصادی دشواریوں کو دور نہیں کر سکتا اور، باوجود اس اعتقاد کے کہ آزاد ہونے کے بعد کشمیر کو کسی نہ کسی بیرونی طاقت کا غلام رہنا پڑے گا، کشمیری مسلمان اس اندیشہ کو بمشکل دل سے نکال سکتا ہے کہ ہندوستان سے الحاق کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کا دست نگر ہو جائے گا، اس کی زندگی اور آبرو ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوگی اور ہندو قوم کی تنگ نظری کا جو تصور جنگ سنگ نے ان کے دل میں پیدا کر دیا ہے اس کو کسی اقتصادی یا سیاسی دلیل سے نہیں محو کیا جا سکتا کیونکہ یہی وہ مواقع ہیں جب مذہب اور مذہبیت کا جذبہ اُبھر کر اور تمام مصالح کو ٹھکرا کر آگے گزر جاتا ہے اور ایک قوم دنیاوی خوشحالی کے مقابلہ میں فاقہ کشی کو ترجیح دینے پر مجبور ہو جاتی ہے — ان حالات کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان کا پہلو کافی ضعیف ہے — اس وقت ہندوستان کے بعض اخبارات میں جو پروپاگنڈا اہل کشمیر کو اپنی طرف مائل کرنے کا اختیار کیا ہے وہ حقیقت کے لحاظ سے غلط نہیں، لیکن اس کی بنیاد صرف اقتصادی اصلاح کی یقین دہانی پر قایم ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، محض معاشی فلاح کا یقین ان بدگمانیوں کو دور نہیں کر سکتا جن کا تعلق مذہب اور مذہبی جذبات سے ہے — یہ تھا گفتگو کا صرف وہ پہلو جو رائے شماری کو ممکن العمل قرار دینے کے بعد سامنے آتا ہے، لیکن غالباً اس سے زیادہ اہم پہلو بحث کا یہ ہے کہ رائے شماری در اصل ممکن بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ حال و مستقبل کے کتنے خطرات اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے — حال ہی میں جو توجہ نامہ پاکستان سے نہرو کے پاس بھیجا ہے اس میں ایک مطالبہ یہ ہے کہ نمٹز کو بدستور ایڈمنسٹریٹر رہنے دیا جائے اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اصولی اختلاف ابھی سے شروع ہو گیا۔ دوسرا مطالبہ پاکستان نے یہ کیا ہے کہ رائے شماری میں وہ لوگ بھی شامل کئے جائیں جو کشمیر سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے ہیں۔ یہ شرط عجیب و غریب ہے کیونکہ اگر ہندوستان اس شرط کو مان بھی لے تو کشمیر سے ہجرت کر کے پاکستان چلے جانے والوں کی صحیح تعداد کا یقین اسے کیونکر ہو سکتا ہے۔ تیسرا مطالبہ یہ ہے کہ رائے شماری یو۔ ان۔ او ہی کی نگرانی میں ہو، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہندوستان نمٹز کو ناظم رائے شماری تسلیم کرے اور بظاہر ہندوستان کی طرف سے اس بات کے تسلیم کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ چوتھا مطالبہ پاکستان کا یہ ہے کہ رائے شماری کے زمانہ میں کشمیر کی حکومت نہ ہندوستان کے پاس رہے نہ پاکستان کے پاس اور دونوں ملکوں کی فوجیں ہٹ جائیں۔ خیر جہاں تک فوجوں کے ہٹائے جانے کا سوال ہے، بظاہر اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی، لیکن یہ سوال البتہ بہت پیچیدہ ہے کہ دوران رائے شماری میں حکومت کسی تیسری پارٹی کی ہو کیونکہ یہ تیسری پارٹی پاکستان کے نزدیک یو۔ ان۔ او ہی ہو سکتی ہے اور ہندوستان اسے مشکل ہی سے تسلیم کرے گا۔

رائے شماری کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کشمیر کے لجلیسچر کو پورے کشمیر کا نمائندہ قرار دے کر اس کی رائے معلوم کر لی جائے، لیکن یہ صورت پاکستان کے لئے کسی طرح قابل قبول نہ ہوگی اور نہ ہو سکتی ہے۔ الغرض رائے شماری کا مسئلہ کسی طرح طے ہوتا نظر نہیں آتا اور رائے شماری کے علاوہ کوئی دوسری صورت اس جھگڑے کو طے کرنے کی اگر ہو سکتی ہے تو وہ بڑی خطرناک ہے۔

مومن کا تغزل

(بہ سلسلہ ماسبق)

اب غالب اور مومن کے موازنہ پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ جناب آسی میرٹھی جنھوں نے "غالب و مومن" کے عنوان سے رسالہ "نگار" کے مومن نمبر میں ایک مقالہ لکھا تھا اس میں انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ تغزل کے اعتبار سے مجموعی طور پر ان دونوں میں کون کس سے بہتر ہے۔ انھوں نے دونوں کے ہم قافیہ اور ہم مضمون اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے کہیں غالب کے شعر کو بہتر قرار دیا اور کہیں مومن کے شعر کو برتر ٹھہرایا۔ جناب معجز سہسوانی نے بھی اپنی کتاب "مومن و غالب" میں موازنہ کا یہی طریقہ (ہم قافیہ و ہم مضمون اشعار کا موازنہ) اختیار کیا ہے لیکن انھوں نے نازک خیالی اور معنی آفرینی اور زبان و بیان کی خوبیوں کے اعتبار سے برتری کا تاج مومن کے سر پہ رکھا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آخر میں یہاں تک فرما گئے کہ "شعر اردو کا اعلیٰ سرمایہ مومن کے سوا کہیں مل سکتا...... خود میر کی حالت یہ ہے کہ ان کے چھ دیوانوں میں ٹھکانے کے شعر سو سوا سو سے زیادہ نہیں ہیں" معجز صاحب نے مومن و غالب کے جن اشعار کو سامنے رکھ کر موازنہ کیا ہے ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کا یہ موقع نہیں۔ مختصر اتنا کہنا کافی ہے کہ ہر چند معجز صاحب نے مومن و غالب کے تقابلی مطالعہ کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ موازنہ کا کوئی صحیح معیار نہیں ہے تاہم اگر وہ پوری غیر جانب داری سے کام لیتے تو غالب کی شاعری کو اس قدر فروتر نہ پاتے جس قدر کہ انھوں نے اسے پایا۔ یہ صحیح ہے کہ بقول حالیؔ مومن نزاکتِ خیال میں غالب سے سبقت لے گئے ہیں لیکن اب زمانہ یا زمانہ کا ذوق سلیم بتا رہا ہے کہ مومن کی وہی سبقت ان کے شاعرانہ مرتبے کے حق میں کس درجہ مہنگی پڑ رہی ہے۔ اور یہ کتنا اچھا ہوا کہ غالب نے اپنے جوہر اندیشہ کی اس گرمی کا زیادہ مظاہرہ نہیں کیا جو ان سے اس قسم کی شاعری کرانے کا باعث ہوئی ؏

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

غالب کے فلسفیانہ انداز کے اشعار کو روکھا پھیکا کہنا مومن کے تغزل کی مدح سرائی کا جزو اور مومن پرستوں کا مستقل شیوہ بن گیا ہے۔ چنانچہ معجز صاحب بھی اس "سنت" کے ادا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ معجز صاحب سے مومن کے کلام میں فلسفہ و تصوف کا فقدان دیکھا نہ جا سکا۔ چنانچہ اپنی تسکین کے لئے انھوں نے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ مومن کے یہاں فلسفہ و تصوف کی بھی کمی نہیں ہے بلکہ مومن کو غالب پر یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ "وہ فلسفہ لکھ جاتے ہیں اور غزل کی رنگینی میں ذرا بھی فرق نہیں آتا" اس باب میں معجز صاحب نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان سے آپ بھی لطف اندوز ہوتے چلیں ؎

دیکھ کر یہ مجمع اعدا کیا ہی ابر اشک آہ ! حلقۂ اغیار اس کے گرد مہ کا ہالہ تھا
تاثیر سوزِ دل کرۂ نار ہے مگر، اِس شعلہ رو کو سینہ سے میرے لگا دیا
لے آب اشک آتشِ عنصر ہے دیکھنا جی ہی گیا اگر نفس شعلہ زا گئے

معجز صاحب کی اس معجزانہ کاوش کے متعلق میری رائے سے پہلے پروفیسر ضیا کی رائے سن لیجئے۔ موصوف لکھتے ہیں: "غالب کے مقابلہ میں بعض اہلِ قلم مثلاً جناب معجز سہسوانی نے کھینچ تان کر فلسفہ و تصوف کے مضامین مومن کے یہاں تلاش کئے ہیں مگر

یہ سعی مشکور نہیں معلوم ہوتی۔"

اگر متجز صاحب کی یہ سعی مشکور بھی ہو جب بھی اس میں کیا شبہ کہ مومن کے مندرجۂ بالا اشعار غالب کے فلسفیانہ اشعار کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

غالب کے بعض فلسفیانہ اشعار میں دل کے تاروں کو چھو لینے والی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ بعض اوقات مومن کے تغزل میں بھی محسوس نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ غالب کے بعض فلسفیانہ اشعار مومن کے تغزلانہ اشعار سے زیادہ مشہور و مقبول ہیں حالانکہ ان دونوں کا مفہوم و مقصود ایک ہی ہے۔ مثلاً:-

غالب:- قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن:- چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

غالب:- رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

مومن:- منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں،
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں،

غالب کے یہ اشعار تغزل کے دائرے سے باہر سہی لیکن ان میں غزلیت کی روح کار فرما ہے۔ ان میں وہی تعمیم، وہی آفاقیت، وہی خلوص اور وہی صداقت اور لب و لہجہ کی وہی نرمی موجود ہے جو ہر اچھی غزل یا غزل کے ہر اچھے شعر میں پائی جاتی ہے۔ اِن اشعار کو خشک فلسفہ کہہ کر گزر جانا تعصب کے لئے آسان سہی لیکن انصاف کے بس کی بات ہرگز نہیں۔ متجز صاحب کا یہ کہنا بھی کھلی ہوئی ناانصافی ہے کہ غالب کے زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جن کو نہ فارسی کہا جا سکتا ہے اور نہ اُردو بلکہ اکثر شعر معمے اور چیستان ہیں۔ فصاحت سے بیگانہ غیر متعارف ترکیبوں سے مملو اور معانی کے لحاظ سے بھی کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ شارحین کا جگر خون ہوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔"

غالب کے دیوان میں ایسے اشعار جن میں مغلق الفاظ اور ثقیل تراکیب استعمال کئے گئے ہیں، جو مفہوم و معنی کے اعتبار سے پیچیدہ اور گنجلک ہیں اُن کی تعداد اُن اشعار کے مقابلہ میں کم ہے جو معنوی خوبیوں سے قطع نظر، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی صفائی و شستگی، تناسب و توازن، ایجاز و اختصار کے دلکش نمونے ہیں۔ البتہ میر کے سے سادہ اور سلیس اشعار اُن کے یہاں بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن غالب کی زیادہ تر غزلوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ ایسی نہیں کہ جسے اُردو کہنے کے لئے کھینچ تان کر ضرورت ہو اور رعایت سے کام لینا پڑے۔ میر کی سی ٹھیٹھ اُردو خود مومن کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ ان کی زبان میں بھی فارسی کا عمل دخل غالب سے کچھ کم نہیں اور اس باب میں جس طرح غالب ہر جگہ حدِ اعتدال کے اندر نہ رہ سکے اسی طرح مومن بھی متعدد مقامات پر بے اعتدالی کے شکار ہوگئے۔ چنانچہ غالب کی طرح مومن کے یہاں بھی کچھ ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک آدھ لفظ ہٹا دیا جائے تو مصرع یا شعر فارسی کا ہوجائے۔ مثلاً ؎

اشک و اثرو نہ اثر باعثِ صد جوش ہوا
ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

ازبسکہ تھی وصال میں غیروں سے ہمسری
عیش و سرور باعثِ رنج و تعب ہوا

وقت جوشِ بحرِ گریہ میں جو گرمِ نالہ تھا
حلقۂ گرداب رشکِ شعلۂ جوالہ تھا

آگ کیا ہم کو لگائی ابر نے تیرے بغیر
وقتِ بارش اخگرِ خورشید تف ہر ژالہ تھا

پس شکستن خم ز جبرِ محتسب معقول،
گنہگار نے سمجھا گنہگار سب مجھے،

پھر سینہ سوز داغِ غمِ شعلہ فام ہے
پھر گرمجوشیِ دل و سودائے خام ہے

یاد آگیا زبس کوئی مہ روئے مہر وش
امید داغِ تازہ سپہرِ کہن سے ہے

لیکن جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ مومن کے کلام کی عام زبان یہی ہے اُسی طرح غالب پر بھی یہ الزام رکھنا درست نہیں کہ ان کے زیادہ تر اشعار کی زبان وہ ہے جسے نہ اُردو کہہ سکتے ہیں اور نہ فارسی۔ اُردو اور فارسی کے خوشگوار امتزاج سے جو زبان وجود میں آسکتی تھی اُس کی پہلی اور دلکش مثال غالب کے یہاں ملتی ہے جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے، فصاحت بلاغت اور ایجاز و اختصار کے لحاظ سے بھی غالب، مومن سے پیچھے نہیں بلکہ روانی اور ترنم کے اعتبار سے خود مومن کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ رہا یہ الزام کہ غالب کے زیادہ تر اشعار کوہ کندن وکاہ بر آوردن کے مصداق ہیں سو اس بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر غالب کے مختصر سے دیوان کے زیادہ تر اشعار ایسے ہی ہوتے تو کم ازکم موجودہ دور انھیں فراموش کرچکا ہوتا۔ غالب کی مقبولیت اور عظمت اُن کے پرستاروں کے زورِ قلم کا صدقہ یا اس دور کی بے بصری کا نتیجہ نہیں ہے ان کے یہاں کوہ کندن وکاہ بر آوردن کے مصداق گنتی کے چند شعر نکلیں گے۔ در اصل یہ خوبی یا خامی زیادہ تر مومن ہی کے اشعار میں پائی جاتی ہے بشرطیکہ اُن کے منظوم خرافات و مہملات کو نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے تعبیر نہ کیا جائے۔

معجز صاحب نے غالب و مومن کا موازنہ کرنے سے پیشتر غالب کی لسانی اور فنی غلطیوں کے چند نمونے پیش کئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ نمونے غالب کی لغزشوں کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن اس باب میں معجز صاحب کا ایک اعتراض ایسا ہے جو اگر ان کی کم سوادی کا تقاضہ نہیں تو ناانصافی کا نتیجہ یقیناً ہے۔ وہ غالب کے اس شعر پر ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام　　قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اُردو غزل کا یہ مسلمہ ضابطہ ہے کہ معشوق کو مذکر لکھا جاتا ہے فعل اور ضمیر سب مذکر لاتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا چاہئے تھا کہ اگر یہی پری زاد وہاں حوریں ہوگئے۔" مجھے یقین ہے کہ اگر مندرجہ بالا شعر غالب کی بجائے مومن کا ہوتا تو معجز صاحب اسے مومن کے اجتہادات میں شمار کرتے ہوئے کہتے کہ دیکھئے جس طرح مومن نے صنفِ لطیف کو اپنا محبوب بنا کر امرد پرستی کی مذموم روایت سے اپنا دامن بچایا ہے اسی طرح محبوب کے لئے صیغہ تانیث استعمال کرکے انھوں نے اپنی صحت مذاق کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ وہ شعر غالب کا ہے اس لئے اس کی سب سے بڑی خوبی کو سب سے بڑی خامی ثابت کرنے کے لئے انھوں نے غزل کے ایک ایسے ضابطے کا سہارا لینے میں تامل نہ کیا جو ایک غیر صحت مند روایت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اگر یہ بات ناانصافی پر مبنی نہیں تو معجز صاحب کی بدمذاقی کی دلیل ضرور ہے کہ وہ پری زادوں اور حوروں کے لئے صیغہ تذکیر کے استعمال پر مصر ہیں۔

معجز صاحب غالب کے کلام میں زبان و بیان کی چند لغزشوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ "ہم نے غالب کے سقطات کا استیعاب نہیں کیا۔ نہ ہمارا یہ مقصد ہے کہ مرزا پر طعن و اعتراض کرکے ان کی کسرِ شان کریں بلکہ باوجود ان کمزوریوں کے ان کی شاعری کا پایہ ہماری نظر میں بہت سے مشاہیر سخنوروں سے بلند ہے اور ہم کو ان کے کمال کا دل سے اعتراف ہے۔ لیکن ابنائے عصر کی کوتاہیٔ نظر پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے مرزا غالب کے کمال کا نمونہ ان کی اُردو شاعری کو قرار دے کر اُن کے بلند مرتبے کو پست کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ مرزا صاحب نے اپنے اُردو کلام کی بابت خود ہی فرمایا ہے:-

بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

اس میں شک نہیں کہ اگر معجز صاحب غالب کی غلطیوں کا استیعاب کرتے تو وہ مزید مثالیں پیش کرسکتے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ غلطیاں غالب کو مومن سے فروتر ثابت کرنے میں ہوسکتی تھیں۔ یہ بات تو جبھی ممکن تھی کہ خود مومن کا کلام اغلاط سے پاک ہوتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور اس امر کا اعتراف پروفیسر ضیا جیسے مومن پرست تک کو ہے کہ "مومن اپنی وارفتہ مزاجی سے صحت زبان اور صفائی بندش کی پروا نہیں کرتے" یہاں اس کا محل نہیں کہ زبان و بیان کے معاملہ میں کلام مومن کی خامیاں

گفتگو کی جائے ورنہ میں اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود مومن کی لغزشوں کے متعدد نمونے پیش کرسکتا ہوں۔ ایک شاعر کو دوسرے اعر سے برتر ثابت کرنے کے لئے ایک کی خامیوں اور دوسرے کی خوبیوں کو پیش کرنا نہ تو صحیح منطق ہے اور نہ صحیح تنقید۔ رہا معجز صاحب یہ دعویٰ کہ غالب کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرنے سے ان کا مقصود غالب کی کسرِ شان نہیں سو ان کی یہ نیک نیتی اپنی ترجمانی آپ رہی ہے۔ انھوں نے غالب کے اُردو کلام کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لئے خود غالب کا یہ قول کہ "بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است اس انداز سے دہرایا ہے کہ پڑھنے والے کہہ اُٹھیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔ میں غالب کے قول کی تردید نہیں کرنا چاہتا رنہ کرسکتا ہوں لیکن اس سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ اگر ان کا اُردو کلام ان کے فارسی کلام کے مقابلہ میں بے رنگ ہے تو کلام مومن مقابلہ میں بھی اس کا بے رنگ ہونا یقینی ہے۔ غالب کی اُردو شاعری ان کی فارسی شاعری سے ہزار پست سہی لیکن وہ بھی اندر اتنا دم خم رکھتی ہے کہ نہ صرف اُردو کے بڑے شاعروں سے ٹکر لے سکتی ہے بلکہ ان میں سے بعض کو شکست بھی دے سکتی ہے اور مومن انھیں شاعروں سے ٹکر لے سکتی ہے بلکہ ان میں سے بعض کو شکست بھی دے سکتی ہے اور مومن انھیں شاعروں سے ہیں۔ جن کا کلام گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے غالب کے اُردو کلام کا مدِ مقابل نہیں کہا جاسکتا۔ نیاز فتحپوری ایک جگہ لکھا ہے کہ "غالب کے یہاں مومن کی سی وہ حقیقت نگاری نہیں جو سینے میں نشتر پر نشتر توڑتی چلی جاتی ہے" اور لباً اسی خیال کو حسرت موہانی نے ایک جگہ یوں ظاہر کیا ہے کہ "مومن کا کلام درد و تاثیر کے لحاظ سے غالب سے افضل ہے"۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں بھی مومن کو غالب سے برتر قرار دینا صحیح نہیں۔ غالب کے یہاں بھی ایسے اشعار خاصی تعداد میں ملتے ہیں جن کی تاب لانا ایک دردمند دل کے لئے آسان بات نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مومن و غالب کے کلام میں جو نشتریت پائی جاتی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ مومن کے پُر درد اشعار میں رو پڑنے والا انداز یاں ہے اور غالب کے ناخن بر جگر اشعار آہوں اور آنسوؤں کو پی جانے والی کیفیت کے حامل ہیں۔ اس خیال کی تائید و توضیح لئے مومن و غالب کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں درد و تاثیر بدرجۂ اتم موجود ہے ؎

ومن :-

کیا کہوں کیونکر رکوں ناصح رکا جاتا ہے دل — پیش کیا چلتی ہے اُس سے جس پہ آجاتا ہے دل
تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا — ترے دل کو بھی میری سی اگر آئے بے وفا لگتی
حالِ دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے — سر اُٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے
اب گریہ میں ڈوب جائیں گے ہم — یوں آتشِ دل بجھائیں گے ہم،
دمبدم رونا ہمیں، چاروں طرف تکنا ہمیں — یا کہیں عاشق ہوئے یا ہوگیا سودا ہمیں،
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

لب :-

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر — عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں
نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں،
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیئے،
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے، — فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں — دل محیطِ گریہ لب آشنائے خندہ ہے

مندرجۂ بالا مثالوں سے مومن کا گریۂ بے اختیار اور غالب کا صبر و تمکیں نمایاں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مومن عشق

کی آگ میں جل رہے ہیں اور رو رہے ہیں۔ غالب تپ رہے ہیں مگر جذبات کی حشر سامانیوں کو فریاد و فغاں میں تبدیل نہیں ہو دیتے یہی وجہ ہے کہ بادی النظر میں مومن کے اشعار غالب سے زیادہ پُر اثر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو پتا چلتا ہے کہ کے اشعار بھی انتہائی درد و کرب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

مومن کو غالب سے برتر ثابت کرنے کے سلسلہ میں پروفیسر ضیا بھی غالب کے متعلق ایک ایسی بات کہہ گئے جو بالکل عام ہے۔ فرماتے ہیں۔ "یہ طرز (ناسخ و نصیر کا طرز) جس کی بڑی خصوصیت آورد تھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی اور دونوں استادو (غالب و مومن) کے ذوق سلیم نے اس کو نباہنے سے ابا کیا۔ آخر غالب نے رنگ میر اختیار کیا اور مومن اپنے ذاتی طرز پر آ گئے۔ ا سلسلہ میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ ان کے ہم عصروں میں ذوق و غالب دونوں مقلد ہیں۔ یعنی ایک کے کلام میں سودا، ق معروف، مصحفی، انشا، جرأت کا تتبع پایا جاتا ہے اور دوسرے کے یہاں بیدل و میر کا۔ صرف ایک مومن ہیں جن کو مجتہد فن جا سکتا ہے۔"

مومن کا صاحب طرز ہونا تسلیم۔ لیکن اس کے لئے غالب کو محض بیدل و میر کا مقلد قرار دینا اگر ناانصافی نہیں تو بے بص یقیناً ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بیدل سے اور آخری دور میں میر سے متاثر ہوئے جس چیز نے غالب کو غالب بنایا وہ ان کی اپنی شخصیت اور انفرادیت ہے جو ان کے اسلوب اور معنی دونوں میں کارفرما نظر دنیا میں کوئی ادیب یا شاعر محض مقلد کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتا چہ جائیکہ وہ اس عظمت و مقبولیت کا مالک بھی غالب کو حاصل ہے۔

غالب کی طرح ذوق بھی محض مقلد نہیں۔ بلکہ ایک مخصوص طرز و منفرد رنگ کے مالک ہیں۔ تغزل کے اعتبار سے ان کے کا مرتبہ جو کچھ بھی ہو لیکن ان کے کلام کی انفرادیت سے انکار کرنا حقیقت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ ان کی انفرادیت کا انداز فکر سے اتنا نہیں جتنا کہ انداز بیان سے ہے اور ان کا انداز بیان اپنی صحت و صفائی، پختگی و مضبوطی کے اعتبار سے کا حیثیت رکھتا ہے۔

دنیا میں کوئی شاعر ایسا نہیں جو اپنے بعض پیشروؤں یا معاصرین سے متاثر نہ ہوا ہو۔ چنانچہ مومن بھی اس باب میں ا کی حیثیت نہیں رکھتے۔ خود پروفیسر ضیا کو اعتراف ہے کہ مومن کے کلام میں سودا۔ میر۔ ناسخ۔ جرأت۔ امانت اور غالب کے ر کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ مومن کے کلام میں ان اساتذہ کے رنگ کو صرف اثرات سے تعبیر کرتے لیکن غالب کے معاملہ میں دوسروں کے اثرات کی بنا پر ان کو سرتاسر مقلد قرار دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی دریافت طلب جب غالب کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے تو پھر مومن کے متعلق یہ اعتراف کرنا کیا معنی کہ ان کے کلام میں غالب کے رنگ کے اشع پائے جاتے ہیں۔ صرف اتنا ہی کہنا کافی تھا کہ مومن کے کلام میں کہیں کہیں میر کا رنگ بھی جلوہ گر ہے کیونکہ بقول پروفیسر موصوف غالب نے رنگ میر اختیار کیا۔" حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں میر کا رنگ صحیح معنی میں ہے ہی نہیں۔ البتہ میر کی سی سادگ حد تک پائی جاتی ہے لیکن صرف زبان کی سادگی کو میر کا رنگ یا طرز نہیں کہا جا سکتا۔ میر کا رنگ جن عناصر سے مرکب ہے زبان کی سادگی، بیان کی نرمی، لب و لہجہ کا دھیما پن، ان کے جذبات کی خستگی و برشتگی سبھی کچھ شامل ہے۔ میر کے ہر اچھے شع یہ تمام عناصر بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور ان عناصر کے اجتماع سے جو فضا پیدا ہوتی ہے وہ کم از کم غالب کے یہاں نہیں غالب کی دنیا میر کی دنیا سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ غالب کی سادگی میں بھی ایک تہ داری ہوتی ہے جو میر کے یہاں نہیں پھر ان کے جذبات و تجربات میں بھی میر کی جھلک تک نظر نہیں آتی بلکہ ایک انوکھی شخصیت اور منفرد مزاج کا احساس ہوتا ایک ایسی شخصیت اور ایک ایسا مزاج جو میر کی طرح غم کوش و حسرت پرست نہ ہونے کے باوجود زندگی کے المیہ پہلوؤں کا

جو غمِ جاناں کی لذتوں سے آشنا ہونے کے باوصف غمِ دوراں کی تلخیوں کو فراموش نہیں کر پاتا، جو عشق و محبت کے معاملات س پرستار ہونے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو طلبگار کی حیثیت سے بھی پیش کرتا ہے، اب آپ غالب کے چند ایسے ر ملاحظہ فرمائیں جو میرے نزدیک ان کے مخصوص رنگ کے آئینہ دار ہیں اور جن سے مذکورۂ بالا خیالات کی تصدیق ہوگی ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا،
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا
گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
تری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے

ان اشعار سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ غالب کے مخصوص رنگ کی جلوہ گری ان کے متفرق اشعار تک محدود ہے۔ اُن کے ں ایسی غزلیں کافی تعداد میں ملتی ہیں جس کا ہر شعر ان کے مخصوص رنگ کا حامل ہے۔ میں مثال کے طور پر چند مطلع کے حوالے پہ اکتفا کرتا ہوں ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی،
گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو
وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

تو یہ ہے غالب کا مخصوص رنگ جس کو میر کے طرز سے اتنی بھی نسبت نہیں ہے جتنی کہ بتوں کو کعبے سے رہی ہے یہی ں بلکہ غالب اپنے اس رنگ کے لئے کسی بھی اردو شاعر کے مرہونِ منت نہیں ہیں۔ اس کے باوجود غالب کو صاحبِ طرز سے انکار کرنا ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا ہے۔ یہاں اس کا محل نہیں کہ غالب کے مخصوص رنگ پر تفصیل کے ساتھ بحث ئے۔ کیونکہ اس مقالے کا اصل موضوع مومن کا تغزل ہے۔

یر سے مومن کا باقاعدہ اور تفصیلی موازنہ تو کسی نے نہیں کیا لیکن مومن کے بعض امتی ان کے مرتبے کی تعیین کے سلسلہ میں ین جملے ایسے لکھ گئے ہیں جو میر و مومن کے طویل سے طویل موازنے پر بھاری ہیں۔ مثلاً معجز صاحب کا یہ جملہ آپ کی نظر سے ہی چکا ہے کہ "شعرِ اردو کا اعلیٰ سرمایہ مومن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ مرزا غالب نے آخر میں کچھ غزلیں میر کے انداز میں ں اور زبان کی سلاست کو مدِ نظر رکھا لیکن کسی نے ان کو میر کا ہم پلہ تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ خود میر کی یہ حالت ہے کہ ان کے دیوانوں میں ٹھکانے کے شعر سو سوا سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ باقی تمام ذخیرہ فحش و ہزل اور انتہا درجہ کا پست کلام ہے۔" یگا اتنے ہی ہولناک جملے پروفیسر ضیا نے بھی لکھے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے "اردو شعرا میں مومن نفسِ تغزل کے اعتبار سے جس

نقطۂ عروج تک پہونچ گئے ہیں دوسروں کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں"۔ ایک اور جملہ ملاحظہ ہو۔ "مجھے شعرائے اُردو میں مومن سے غیر معمولی شغف رہا ہے۔ اور میں (میر کو چھوڑ کر) نفسِ تغزل میں کسی کو ان کا ہم پایہ نہیں سمجھتا"۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ معجز صاحب اور پروفیسر ضیا نے اتنے بلند آہنگ دعووں کے اثبات میں ایک بھی دلیل پیش نہیں کی۔ گویا یہ دعوے کھلے ہوئے حقایق ہیں جن کی صحت میں کسی کو شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ عیاں را چہ بیاں یا آفتاب آمد دلیل آفتاب، اول تو معجز صاحب کا یہ اندازہ ہی غلط ہے کہ میر کے چھ دیوانوں میں "ٹھکانے کے شعر سو، سوا سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ میر کے کلام کا کتنا ہی سخت انتخاب کیوں نہ کیا جائے اچھے اشعار تین چارسو کی تعداد میں ضرور ہی نکلیں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے مانے لیتا ہوں کہ میر کے یہاں ٹھکانے کے شعر سوا سو سے زائد نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ اُن اشعار نے تغزل کا جو معیار قایم کر دیا ہے وہاں تک اُردو کے چند بہترین متغزلین میں کوئی بھی نہیں پہونچتا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر میر کے زمانے سے لے کر عہدِ حاضر تک کے اربابِ نظر متفق ہیں۔ کاش معجز صاحب محسوس کر سکتے کہ میر پہ خاک ڈال کر مومن کو میر سے برتر ثابت کرنا تو ممکن نہیں البتہ ذوق و نظر کو رسوا کرنا آسان ہے۔ پروفیسر ضیا کے پہلے جملے سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مومن اُردو کے بہترین غزل گو ہیں بلکہ یہ بھی کہ دیگر بلند پایہ متغزلین ان سے بہ مدارج فروتر ہیں۔ پروفیسر موصوف نے دوسرا جملہ کسی قدر سنبھل کر لکھا ہے لیکن اُس سے بھی میر کے مقابلہ میں مومن ہی کی برتری کا پہلو نکلتا ہے۔ ان بلند بانگ دعووں کو سن کر ممکن ہے خاقانی اور ظہیر فاریابی کی روحیں خوش ہو گئی ہوں کہ اُردو نثر میں ان کا ایک جانشین پیدا ہوا لیکن ان دعووں کو صحیح تنقید سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ کاش پروفیسر ضیا کو معلوم ہوتا کہ حد سے گزری ہوئی عقیدت خود صاحبِ عقیدت کی مٹی پلید کر ڈالتی ہے۔ نیاز فتحپوری نے مومن کو نہ تو میر سے برتر قرار دیا ہے اور نہ اُن کا ہمسر ٹھہرایا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی ان کے نزدیک مومن کا جو درجہ ہے وہ بحث طلب ضرور ہے۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں۔ "اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیاتِ مومن دیدو اور باقی سب اُٹھا لے جاؤ"۔ نیاز صاحب کے ان جملوں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کے شعرائے متاخرین تک تغزل کے اعتبار سے میر کے بعد سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ جہاں تک نیاز صاحب کا تعلق ہے ان کا جواب بھی ان ہی جملوں میں پوشیدہ ہے یعنی ان کے نزدیک میر کے بعد غزل کے سب سے بڑے شاعر مومن ہیں۔ لیکن اربابِ نظر کے درمیان مومن کا یہ مرتبہ بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب میں نے حضرت وحشت کلکتوی سے متذکرہ سوال کیا تو انھوں نے جواب میں مومن کی بجائے داغ کا نام لیا اور جب اس باب میں میں نے اپنے بعض سخن فہم احباب کی رائے دریافت کی تو ان میں کسی نے میر کے بعد مصحفی کو بہترین غزل گو قرار دیا اور کسی نے آتش کو۔ پھر جب میں نے پروفیسر حامد حسن قادری سے رجوع کیا تو انھوں نے یہ لکھا کہ "اس سوال کا ایسی آسانی سے جواب دینے سے معذور ہوں کہ خالص تغزل میں کسی ایک شاعر کو بہترین بتا دوں۔ شاعری میں میرے نزدیک یہ دیکھنا کافی نہیں کہ کیا کہا اور کتنا کہا۔ بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح کہا۔ مجازی عشق و محبت کی شاعری میں جذبات، معاملات، ادائیں، شانیں سبھی نے لکھیں مگر کثرت و وسعت سے قطع نظر کر کے کہنے کی تازگی اور خوبی میں میر کے بعد مصحفی، غالب، مومن، داغ اور ریاض کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ (میں غالب کو مجازی شاعر بھی سمجھتا ہوں اور ریاض کو داغ کا ہم عصر مانتا ہوں، امیر مینائی کا شاگرد نہیں) اس خمسہ کے ارکان اپنی انفرادی خوبیوں میں ایک دوسرے سے اس قدر الگ اور ممتاز ہیں کہ ایک کا انتخاب کرنے سے دوسروں کی خوبیاں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً مومن کو لے لیجئے تو مصحفی کا لوچ، غالب کا فکر، داغ و ریاض کی زبان اور شوخی رہی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی ایک ہی کو لینا ہو تو ریاض بہتر رہیں گے۔ میں اپنی پسند سے تو عشقیہ شاعری ہو یا فکریہ، غالب ہی کو بہترین سمجھتا ہوں"۔

جب میں نے ان سطور کے جواب میں اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے قادری صاحب سے دوبارہ پوچھا کہ آپ کے نزدیک عشقیہ جذبات و محسوسات کی گہرائی کے اعتبار سے میر کے بعد اردو کا بہترین غزل گو کون ہے تو انھوں نے لکھا کہ:-

"بہترین غزل گو کے مسئلے میں آپ نے جذبات و محسوسات کے "گہرے اچھلے" ہونے کی شرط نہیں لگائی تھی اعلیٰ عشقیہ شاعری کی اصل روح کا سوال ہو تو میر و غالب کو چھوڑ کر اللہ کا نام ہے۔ میں نے ریاض کو اور دوسروں نے آتش، مومن، داغ کو صرف حسن و عشق کے جذبات و معاملات کی کثرت و وسعت رنگینی اور رنگا رنگی کے سبب سے تجویز کیا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ ان میں گہرائی یا آفاقیت ہے یا نہیں۔ یہ اوصاف اگر ملیں گے تو چوٹ کھائے ہوئے دلوں میں ملیں گے یا فطرت انسانی اور فطرت عالم سے ہمدردی رکھنے والے ذہنوں میں ملیں گے۔ آتش کے لکھنوی رنگ میں صناعی اور تصنع بے حد ہے۔ مومن اور داغ شاہد باز ہیں۔ ریاض سستے جذبات سے کھیلنے والے ہیں۔ ان میں اعلیٰ عشقیہ شاعری کو ڈھونڈنا عبث ہے۔ یوں دس دس بیس شعر مل جائیں گے۔ یہ بات مصحفی کے دور تک ملتی ہے۔ خود مصحفی میں ملتی ہے۔ پھر داغ کے دور میں حالی جیسوں میں ملتی ہے۔ حالی کی غزلوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیجئے۔ بہت ہی خوب غزل گو ہے۔"

مندرجۂ بالا مختلف رایوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح میر کے امام المتغزلین ہونے پر تمام اہل نظر کا اتفاق ہے ویسا اتفاق میر کے بعد کسی دوسرے غزل گو کے متعلق ممکن نہیں۔ اس باب میں میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی صرف اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ اسے بھی ایک شخص کی "ذاتی پسند" سے زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی مانع ہے کہ اس اہم کے پیچیدہ اور نازک مسئلہ میں صرف اپنی رائے ظاہر کر کے الگ ہو رہنا یا آگے بڑھ جانا کوئی معنی بھی نہیں رکھتا۔ اس قسم کی بڑی تفصیل کے ساتھ اظہار خیال چاہتی ہے اور اس تفصیل کے لئے ایک علٰحدہ مقالے کی ضرورت ہے۔ اس لئے میں زیر نظر بحث کو آیندہ کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

(باقی) نظیر صدیقی

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی
(انجیل انسانیت)
من و یزداں کامل
کا
جدید اڈیشن

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذہب کی تخلیق، مذہبی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

منیجر نگار لکھنؤ

حقیقت وفات حضرت عیسیٰ بن مریم

انجیل میں قتل مسیح کا ذکر

انجیل کے مصنفوں کے متعلق ہمیں صرف اتنی معلومات ہے کہ پہلی صدی مسیحی میں بہت سے لوگوں نے حضرت عیسیٰ کے حالات اور اقوال لکھے تھے، پھر دوسری صدی مسیحی میں ان میں سے چار انجیلیں منتخب کی گئیں۔ یوحنا کی انجیل کے علاوہ متی، لوقا اور مرقس سب ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ ان چاروں انجیلوں کا درجہ مسلمانوں کی احادیث و سیر کی کتابوں کا درجہ ہے اور کتب الہیہ میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان میں نصرانیت کے وہ عقاید جو بعد میں بنائے گئے، بہت کم پائے جاتے ہیں۔

ان اناجیل کی روایات کے مطابق قیصر طائبیریس کے زمانہ میں حضرت یسوع اپنے گاؤں ناصرہ سے عید فسح کا تہوار منانے یروشلم (دار السلام) آئے تھے۔ ان کی عمر تینتیس سال کی تھی اور وہ "حکومت الہیہ" (یعنی دنیا میں ملوکیت الہیہ Kingdom of Heaven کے قایم ہونے یا اس کے آنے کی خوش خبری (انجیل) دنیا والوں کو سناتے تھے۔ انکی بول چال دیہاتی تھی اور وہ انسانوں کی طرح کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، غصہ اور رنج کرتے تھے۔ لیکن وہ اللہ کی بندگی کا پیغام لائے تھے اور بقول مصنفین اناجیل وہ دعا کرتے تھے کہ:- جس طرح آسمان پر ملوکیت الہیہ قایم ہے اسی طرح اس دنیا میں بھی کنگڈم آف ہیون (ملوکیت الہیہ) قایم ہو۔"

بابل کی قید کے زمانہ میں جب یہودیوں نے اپنی گم شدہ توراۃ مرتب کی تھی، تو انھوں نے مجوس سے یہ عقیدہ سیکھا تھا کہ خدا کی حکومت آسمان پر ہے، زمین پر نہیں ہے، یہاں اہرمن کا راج ہے۔ اسی لئے حضرت عیسیٰ بھی اسی تصور کو ظاہر کرنے والے بتائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے یہودیوں کو یہ بھی بتایا کہ یہوا صرف تمھارا ہی خدا نہیں ہے، بلکہ دنیا کی کل قوموں کا خدا ہے۔ اسے قرآن نے اس طرح کہا ہے (الٰہنا و الٰہکم الٰہ واحد) مگر یہود نہ تو خدا کو سب قوموں کا خدا ماننے کو طیار تھے نہ ان کی ایک جماعت بعثت بعد الموت کی قایل تھی۔ لہذا انھوں نے حضرت یسوع ناصری پر یہ الزام لگایا کہ یہ رومی شہنشاہیت کا باغی ہے اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو مسیح (بادشاہ) کہتا ہے۔- - - - - - - - - - - - - - گویا کہ یہودیوں کا بادشاہ بن کر قیصر طائبیریس کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے۔

جزئیات کو چھوڑ کر چاروں انجیلیں اس پر متفق ہیں کہ یہودیوں نے حضرت یسوع کو پکڑ کر رومی گورنر پلاطوس کے سامنے پیش کیا کہ اسے بغاوت کے جرم میں سزا دیجائے۔ گورنر کو آپ کے مجرم ہونے میں شک تھا، لہذا اس نے حسب دستور یہ اعلان کیا کہ عید فسح کی خوشی میں جو جاں بخشی ہوتی ہے اس سلسلے میں یا تو وہ یسوع کو آزاد کرالیں یا ڈاکو برباس کو۔ لوگوں نے برباس کو مانگ لیا اور شور مچایا کہ (حضرت) عیسیٰ کو سولی دی جائے۔ آخر مجبوراً پلاطوس نے سولی دینے کا حکم دیدیا۔

حضرت عیسیٰ نے اس فیصلہ کو نہایت پامردی کے ساتھ سنا اور دستور کے مطابق خود اس صلیب کو لے کر مقتل کی طرف چلے جس پر انھیں صلیب دیجانے والی تھی۔ ان کے وقار میں ذرا فرق نہیں آیا۔ ان پر یہ مصیبتیں نازل ہوئیں کہ انھیں بشر ماننے والے بھی چھوڑ کر چل دئے، حتیٰ کہ حواریوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ یہی نہیں بلکہ ان میں سے ایک (یہوداہ) نے غداری کی اور دوسرے (پطرس) نے آپ کو بشیر و مبشر ماننے سے انکار کردیا، عوام نے مذاق اڑایا،

غلاموں اور سپاہیوں نے تھپڑ لگائے اور تھوکا، کسی نے کانٹوں کا تاج لاکر پہنا دیا کہ دیکھئے یہ "یہودیوں کے بادشاہ (مسیح) ہیں" اور پھر انتہا ہوئی کہ دو چوروں کے درمیان سولی پر چڑھا کر ذلیل کیا۔

(جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے انھیں اطمینان ہو گیا کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم کو صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیا اور خود پیروان مسیح نے بھی یہ مان لیا کہ وہ صلیب پر قتل کر دئے گئے۔ چاروں انجیلوں میں یہ ذکر موجود ہے،

حضرت عیسیٰ کا دوبارہ پیدا ہونا

حضرت عیسیٰ کو جمعہ کے دن سولی دی گئی تھی وہ جسمانی طور پر کمزور تھے کیونکہ راویوں نے لکھا ہے کہ صلیب کو لے کر چلتے چلتے وہ بہت تھک گئے اور ایک جگہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

بہر حال چونکہ دوسرے دن "سبت" یا سنیچر کا دن تھا اور سپاہی پہرہ چھوڑ کر چھٹی منانا چاہتے تھے اس لئے جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت مسیح کی گردن لٹک گئی تو ایک سپاہی نے سینہ پر نیزہ مارا تو پانی ملا ہوا خون نکلا، انھوں نے حرکت نہ کی، تو یہ سمجھ کر کہ وہ وفات پا گئے، انھیں سولی سے اتار دیا اور حسب دستور ان کے پاؤں نہیں توڑے۔ پھر مسیح کے ایک حواری کو لاش دیکر چلتے بنے۔

آپ کی لاش ایک غار میں رکھدی گئی اور تیسرے دن اتوار کو آپ دو عورتوں کو نظر آئے۔ یعنی وہ بارہ زندہ ہو گئے اور بقول نصاریٰ کے اب تک زندہ اور قایم ہیں اور دکھی کی پکار سنتے ہیں اور مدد کرتے ہیں۔ جب وہ حواریوں کو نظر آئے تو وہ ڈر گئے کہ یہ کوئی روح ہے۔ بہر حال انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ مادی جسم میں ہیں انھیں اپنے زخمی ہاتھ دکھائے پھر مچھلی کھا کر یہ ثابت کیا کہ وہ جسم کے ساتھ موجود ہیں۔ محض روح ہوتے تو کھانے کی حاجت نہ ہوتی۔ اسکے بعد حواریوں کو نصیحت کی کہ وہ دنیا بھر میں "ملوکیت الٰہیہ" کی تبلیغ کریں۔" اس کے بعد وہ آسمان پر چلے گئے اور خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہیں" (مرقس) اور بقول لوقا وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے" (لوقا ۵۱)۔ متی میں آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر نہیں ہے لیکن یہ تفصیل درج ہے کہ کسی آسمانی فرشتے نے غار کے منھ سے پتھر ہٹا دیا اور پہرے کے سپاہی ڈر کر بھاگ گئے۔ اور اس نے مریم مگدلینی اور دوسری مریم کو بتایا کہ مصلوب یسوع مُردوں میں سے "اٹھ" گئے ہیں (یعنی زندہ ہو گئے ہیں) ممکن ہے کہ اسی "اٹھنے" یا "رفع" ہونے یا "بلند" ہونے کے تلفظ نے "زندہ ہو کر اٹھنے" یعنی "آسمان پر اٹھائے جانے کا جامہ پہن لیا ہو۔ بہر حال فرشتے نے یہ بھی بتایا کہ آؤ دیکھو جیسا کہ مسیح نے کہا تھا کہ میں اٹھ جاؤں گا، وہ اٹھ گئے ہیں اور کفن خالی پڑا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ عورتیں خوف و مسرت کے احساسات کو لئے ہوئے حواریوں کو اطلاع کرنے دوڑیں کہ یسوع نے انھیں سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ جلیلی میں ملو۔ پھر متی یہ بھی روایت بیان کرتا ہے کہ یہودیوں نے سپاہیوں کو رشوت دے کر اس پر راضی کر لیا کہ وہ کہدیں کہ یسوع کے حواری ان کی لاش کو چرا لے گئے۔ آخر میں متی کہتا ہے کہ حواریوں کو نصیحت کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ میں ہمیشہ دنیا کے خاتمہ تک تمہارے ساتھ رہوں گا، یعنی طور پر تمہاری مدد کرتا رہوں گا۔

انجیل کی روایات کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) حضرت یسوع مسیح بے گناہ صلیب پر چڑھائے گئے۔ یہ محض یہودی سردار ربی (ہیڈ پریسٹ) کی معاصرانہ چشمک کی وجہ سے ہوا۔ وہ انھیں ذلیل کرنا چاہتا تھا۔

(۲) حضرت یسوع نے بلند آواز خدا کو پکارا اور صلیب پر وفات پا گئے، پھر ان کی لاش ایک غار نما قبر میں رکھدی گئی جہاں سے وہ زندہ ہو کر "اٹھ" گئے اور کفن سے غائب ہو گئے، یا بقول یہود وہ لاش چوری ہو گئی۔

(۳) حواریوں نے جب اُن کو دیکھا تو بعض شبہ کرنے لگے کہ یہ وہی مصلوب یسوع ہیں یا نہیں۔ بہر حال اُن کے کھانا کھانے پر حواری مان گئے کہ یہ مسیح کی روح نہیں بلکہ خود مسیح مع جسم و روح کے ہیں۔ ورنہ "طعام" کیوں کھاتے۔

(۴) نصیحت کرنے کے بعد وہ "رفع" کرلئے گئے۔ یا "رفع" ہوگئے اور "اللہ" کے قریب رہتے ہیں۔ اور اپنے ماننے والوں کے ساتھ قیامت تک رہیں گے اور اُن کی پکار سنیں گے۔

قرآن اور قتل مسیح

ہرشفلڈ نے قرآن کریم کی ایک ایک آیت پر غور کیا ہے اور بائبل کی آیات سے پورے قرآن کی مطابقت دکھائی ہے۔ اس نے سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک رسالہ انڈین انٹی کوئری بمبئی میں "قرآن کی نئی تحقیقات" کے نام سے ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا جو بعد میں کتابی شکل میں چھپ گیا ہے اور اس کا عربی ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔ اُس نے قرآن کو مختلف زمانوں میں بھی تقسیم کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً پورا قرآن لفظ بہ لفظ بائبل میں موجود ہے۔ لیکن چونکہ پورا قرآن زبان وحی میں موجود ہے اس لئے بائبل کے ترجموں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ بہر حال معناً دونوں کتابیں یکساں ہیں اور لفظاً بھی بہت کچھ مشابہ ہیں۔ خود قرآن کریم بھی اسے مانتا ہے (کتاباً متشابہاً مثانی۔ سورۂ الزمر)

اس طرح قرآن پر غور کرنے سے یہ عجیب و غریب بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ خود قرآن میں محاسن کے ساتھ ساتھ اضداد موجود ہیں۔ اور اگر کسی لفظ کے مختلف "وجوہ" ہیں تو جن مخصوص معنوں پر قرآن نے توجہ دلائی ہے وہ اُسی جگہ واضح کردئے گئے ہیں، مثلاً ضلال و ہدیٰ، عائل و غنی، ضحی و لیل، حق و باطل، قرآن و سحر، ظالم و قاسط، قتل و رفع ذکر وغیرہ وغیرہ۔

اب اس نقطۂ نظر سے کہ (۱) قرآن کتب اولین کی تصدیق کرتا ہے۔ (۲) قرآن کتب اولین سے معناً مشابہ ہے اور لفظاً بھی بڑی حد تک اور (۳) قرآن میں ہر لفظ کی تفسیر خود قرآن ہی سے مل جاتی ہے، اگر ہم اُن آیات کو دیکھیں جو قتل و صلب مسیح کے متعلق ہیں تو جو پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ رفع ہوجاتی ہیں۔ آیات یہ ہیں:-

فبما نقضهم میثاقهم وکفرهم بآیات اللہ
وقتلهم الانبیاء بغیر حق وقولهم قلوبنا غلف ط
بل طبع اللہ علیها بکفرهم فلا یؤمنون الا قلیلا ۵
وبکفرهم وقولهم علی مریم بهتاناً عظیماً ۵ وقولهم انا
قتلنا المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ، وما
قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبه لهم ط وان الذین
اختلفوا فیه لفی شک منه ط ما لهم به من علم
الا اتباع الظن ج وما قتلوہ یقیناً ۵ بل رفعه
اللہ الیه ط وکان اللہ عزیزاً حکیماً ۵ وان
من اهل الکتاب الا لیؤمنن به قبل موته،
ویوم القیامة یکون علیهم شهیداً ۵ (النساء ع ۲۲)

پس (یہودیوں کو جو سزائے غلامی ملی اور طیبات اُن پر حرام کئے گئے) وہ اُنکے میثاق کو توڑنے اور اللہ کے احکام (آیات اللہ) کے انکار اور ناحق نبیوں کو قتل (ذلیل) کرنے کی وجہ سے اور اُنکے اس قول پر ہوا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے (ہم کلام اللہ نہیں سُن سکتے)۔ یہی نہیں بلکہ اللہ نے اُنکے دلوں پر مُہر لگادی ہے بوجہ اُنکے کفر کے، ان میں سے سوائے چند یہودیوں کے کوئی ایمان نہ قبول کرے گا۔ اسکے علاوہ اُن کے کفر اور مریم پر (بے عصمتی) کا بڑا بہتان لگانے اور اُنکے اس قول کی وجہ سے (وہ ذلیل کئے گئے) کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل (ذلیل) کردیا۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اُنھوں نے اُس کو نہ قتل کیا نہ صلیب دی، بلکہ اُن کے لئے خدا نے حالت مشتبہ کردی، اور جو لوگ قتل مسیح کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں وہ اس مسئلہ پر شک میں مبتلا ہیں۔ ان کو حقیقی علم نہیں بلکہ وہ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں، یہودیوں نے مسیح کو یقیناً قتل (ذلیل) نہیں کیا نہ صلیب دی، بلکہ اللہ نے اُسے اپنے پاس اُٹھا لیا اور اللہ کی اس میں عزت و حکمت پائی جاتی ہے اور اہل کتاب (یہود) میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو اپنی موت سے پہلے یہ بات نہ مان لے اور قیامت کے دن مسیح اُن پر گواہ ہوگا۔ (النساء ع ۲۲)

ان آیات میں محض تلمیحات و اشارات سے مندرجہ ذیل باتیں بتائی ہیں اور اس طرح بتائی ہیں کہ سننے والے یعنی یہود و نصاریٰ ے طور پر سمجھ گئے اور جان گئے کہ قرآن سچ کہتا ہے اور تصدیق انجیل کرتا ہے :-

۱) یہودی حضرت مریم پر بہتان عظیم لگاتے ہیں - (یہ بہتان قرآن میں بالتصریح درج نہیں - یہودیوں کا بہتان یہ تھا کہ وہ رت مریم کو پاکباز نہیں مانتے تھے - قرآن نے بارہا اس افترا پردازی کی تردید کی ہے، اور کہا ہے کہ حضرت مسیح روح اللہ تھے حضرت مریم محصنہ تھیں' یہ قرآن کی انتہائی بلاغت ہے کہ احصان کے اضداد کا استعمال نہیں کیا۔ اور اشارتاً حقیقت حال تی - یہی نہیں بلکہ قرآن نے بار بار یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم بے باپ کے پیدا کئے گئے اور اُن کو اللہ کی ایک روح نے بشر کر ایک "غلام زکی" دیا (فارسلنا الیہ روحنا فتمثل لھا بشراً سویا۔۔۔۔ قال انما انا رسول ربک لاھب لک غلاماً زکیا) ا پر حضرت مریم کو تعجب ہوا کہ جب میں نے کسی مرد کا منہ نہیں دیکھا تو بچہ کیسے ہوگا (قالت انیٰ یکون غلاماً ولم یمسسنی ر ولم اک بغیا) تو وہ بولا کہ خدا کے لئے یہ آسان ہے، ایسا ہی ہوگا (قال کذلک قال ربک ھو علیّ ھیّن" (سورۂ مریم)

۲) یہود کہتے تھے کہ ہم نے مسیح کو قتل کر دیا - قرآن کہتا ہے وہ "شک" "شبہ" اور "ظن" میں گرفتار ہیں - انھوں نے ہرگز نہیں کیا بلکہ اللہ نے اُنھیں اٹھا کر (رفع کر کے) اپنے پاس بلا لیا - (یہاں قتل کے مقابلہ میں "رفعہ اللہ" کا لفظ استعمال ہے - یہی "رفع" کا لفظ انجیلوں میں ہے) - یہ دونوں الفاظ تمثیاً بطور اضداد کے استعمال ہوئے ہیں - قتل بمعنی ذلت رفع بمعنی عزت کے ہیں - اس کی مثالیں یہ ہیں :-

ا) :- (الف) فاقتلوا انفسکم (س ۲: ۶۱) یعنی منکسر مزاجی اختیار کرو - (دیکھئے نہایہ راغب) قتل نفس سے اماتۃ الشہوات د ہے -

ب) کسی کو ذلیل کرنا مثلاً "قتل الخراصون الذین فی غمرۃ ساھون" (الذاریات) قیامت کے بارے میں شک کرنے والے عقلی گدے لگانے والے ذلیل ہوں (یا ان کا بُرا ہو) انھیں قیامت کی حقیقت اُس وقت معلوم ہوگی جب وہ جہنم میں لے جائیں گے اور اپنی آنکھ سے عذاب دیکھ لیں گے (یوم علی النار یفتنون - الذاریات)

اسی طرح کا ایک محاورہ (قاتلھم اللہ) ہے یعنی اللہ کی اُن پر مار پڑ چکی یا مار پڑے، یا دوسری جگہ (قتل اصحاب الاخدود) - اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ خدا اصحاب الاخدود کو ذلیل کیا یا ذلیل کرے - حالانکہ یہ بات اُن کے مرنے کے عرصۂ دراز کے قرآن میں آئی - اور وہ یقیناً ذلیل ہو چکے گویا اس کے معنی ماضی اور مستقبل دونوں کے ہیں -

قتل کسی چیز کے زور اور تیزی کو گھٹا دینے کے لئے بھی استعارہ استعمال ہوتا ہے، جیسے (قتلت الخمر بالماء) یعنی ب میں پانی ملا کر اُسے قتل کر دیا یعنی اُس کی تیزی کم کر دی -

ج) قتل کے لغوی معنی ہلاک کرنے کے ہیں - اس سلسلے میں قرآن بار بار بتاتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں رفیع و عزیز ہوتے ہیں اور جو طاغوت کی راہ میں قتل ہوتے ہیں -

چونکہ یہود کا یہ شیوہ تھا کہ اللہ کے رسولوں کے احکام ماننے کی جگہ اُن کی نافرمانی کر کے اُنھیں ذلیل کرتے تھے اور ملتا تھا تو ہلاک بھی کر ڈالتے تھے - مصر کی غلامی کے زمانہ میں خود حضرت موسیٰ کو قتل کرا دینے کے لئے یہودیوں نے گواہی تھی - پھر حضرت زکریا (متی ۲۳) اور حضرت یحییٰ (متی ۱۴) کو قتل کر ڈالا تھا - اور بعض پرستی، سود خوری، اور وت پرستی اختیار کی تھی اسی لئے ان کے ظلم و کفر کی مثالوں میں قتل انبیاء کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ ویقتلون النبیین الحق - بقرہ ۶۱) یہاں قتل کے دونوں معنی حسب موقع و سیاق عبارت لئے جا سکتے ہیں - کہیں ہلاک کرنا مراد ہے کہیں ل کرنا - اب (رفع) کے معنوں پر غور کیجئے :-

رفعٌ :۔ اس کے معنی ہیں بلندی، علو، ترقی، عزت، ہٹا دینا (زائل کرنا)۔ زیادہ کرنا۔ فراخی۔ عیش، اونٹ کو ہانکنا، محاصرہ اُٹھا دینا۔ معاف کردینا (ٹیکس وغیرہ)

رفعٌ :۔ (فی) مبالغہ کرنا۔

رفع و رُفعانٌ (الی) : کسی کو کسی کے نزدیک کرنا ("رفعہ اللہ الیہ" اللہ نے اُسے اپنی نزدیکی یا قربت بخشی)

رفع سلاح، صلح کرلینا۔ رفع جواب :۔ خطاے جانا۔ رفع یدعنْ، کسی کام سے ہاتھ اُٹھا لینا یا ہاتھ کھینچ لینا۔

رفع کی ضد ہے وضع۔ (رفعنا لک ذکرک) ہم نے تیری عزت بڑھائی (ووضعنا عنک وزرک) اور تیری پریشانی گھٹائی، سورۃ الانشراح)

یرفع اللہ الذین آمنوا منکم (والذین اوتوا العلم درجات۔ سورۂ مجادلہ آیت ۱۱) مومنوں اور اہل علم کے درجے اللہ بلند کرے گا، یعنی عزیز ہوں گے ذلیل نہ ہوں گے۔ اسی طرح حضرت ادریس کے متعلق اسی سورۂ مریم میں اسی رفعت کا استعمال کیا جو اسی سورہ میں حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کے لئے مذکور ہوا۔

فرمایا کہ "انہ ماکان صدیقاً نبیاً، ورفعنٰہ مکاناً علیاً۔" (ادریس ایک صدیق نبی تھا اُسے ہم نے مقام بلند پر سرفراز کیا) اس سے یہ مراد نہیں کہ اُنھیں آسمان پر پہونچا دیا۔ (سورۂ مریم ۵۷)

یا فرمایا کہ "رفعنا بعضہم فوق بعضٍ درجات" (سورہ الزخرف ۴۳) یعنی ایک آدمی کو دوسرے پر بلند رتبہ دیا۔

رفع نہ صرف انسانوں کی عزت بڑھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے بلکہ اشیاء کے لئے بھی ہوتا ہے، مثلاً "فی صحفٍ مکرمۃ مرفوعۃ مطہرۃٍ" (سورہ عبس ۱۴) میں مرفوعہ کے مترادفات مکرمہ و مطہرہ ہیں۔ اسی طرح جنت میں جو تخت ہوں گے انھیں بھی رفعت و شوکت کے لحاظ سے مرفوعہ کہا گیا ہے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ فرش سے بلند ہیں، اس لئے کہ فی نفسہٖ کسی چیز کا بلند جگہ پر ہونا یا خود بلند ہونا اُس کے شاندار ہونے کی دلیل نہیں، یہاں مرفوعہ سے مراد معزز و شاندار، یا مکرمہ و مطہرہ کے ہیں دیکھئے "فیہا سُرُرٌ مرفوعۃ" (سورۂ الغاشیہ ۱۳) اسی طرح فرش کو بھی مرفوعہ کہا گیا ہے، یعنی عام سطح سے بلند ہونے کی وجہ سے وہ معزز و شاندار معلوم ہوتا ہے، "وفُرُشٍ مرفوعۃٍ" (سورہ الواقعہ ۳۴) سے مراد ہے ایسے گدّوں کی جو اپنی دبا
کی وجہ سے سطح زمین سے اونچے ہوگئے ہوں۔

"وکان اللہ عزیزاً حکیماً"۔ رفع مسیح کے سلسلے اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ عزیز و حکیم ہے۔ دیکھئے "رفعت" کی مناسبت سے خدا کی صفت "عزت" بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح پہلے فرمایا ہے (وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدہ الخیر) یعنی عزت و ذلت دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ یہود کیا چیز ہیں جو کسی خدا کے رسول کو ذلت دے سکیں۔

(۳) تیسری بات جس پر قرآن نے زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ (ان من اہل الکتاب لیؤمننّ بہ قبل موتہ) یعنی اہل کتاب "اُس کو" "اپنی موت" سے پہلے مان لیں گے کہ سچ ہے۔ یہاں بہ کی ضمیر اس واقع کی طرف ہے کہ قرآن سچ کہتا ہے کہ وہ مسیح کو قتل (ذلیل) نہیں کرسکے، اور یہ بھی ثابت نہیں کرسکے، ام عیسیٰ غیر محصنہ تھیں۔

اہل کتاب سے مراد اہل علم اور سچے یہودی ہیں، اور (موتہ) کی ضمیر ان ہی یہود کی طرف ہے کہ اپنے مرنے سے پہلے وہ حضرت مسیح کے علوئے مرتبت اور حضرت مریم کے احصان کے قایل ہوجائیں گے۔

آلِ عمران کی مندرجہ ذیل آیتوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جو یہودی اپنی زندگی میں اسے نہ مانیں گے، وہ مرنے کے بعد دیکھ لیں گے کہ حضرت مسیح کو کتنا بلند مرتبہ ملا ہے اور حضرت مریم پاکباز ہیں۔

وفات مسیح کے سلسلے میں سورۂ آل عمران کی یہ آیات قابلِ غور ہیں :۔

ومکروا ومکر اللہ ط واللہ خیر الماکرین ط
اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی متوفیک و
رافعک الیّ ومطہرک من اللذین کفروا
الی یوم القیامۃ، ثم الیّ مرجعکم
فاحکم بینکم فیما کنتم فیہ تختلفون ٥
(آل عمران ۶۴)

اور مکر کیا (یہود نے) اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤں دوسرے داؤں والوں سے بہتر ہے۔ جب اللہ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تجھے وفات دوں گا اور اپنے پاس اٹھا لوں گا، پھر کافروں (یہود) کے الزامات سے تجھے بری کروں گا، اور تیرے پیروؤں (نصاریٰ) کو کافروں (یہود) پر غالب کر رکھوں گا قیامت کے دن تک۔ پھر جب (مرنے کے بعد) میرے پاس تم سب واپس آؤگے، اُس وقت جس معاملے میں تمہارا اختلاف تھا اُس کا [illegible]صلہ کروں گا۔ (یعنی مریم محصنہ تھی اور تو پاکباز تھا اللہ کا بندہ اور رسول تھا)

وفات کے معنی یہاں موت کے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے سورۂ مریم میں مذکور ہوا۔ حضرت عیسیٰ کو وفات دینا یا موت ہونا اس لئے ضروری تھا کہ وفات ہر مخلوق کے لئے ضروری ہے صرف اللہ حی و قیوم ہے۔ یہاں رافعک بمعنی مطہرک بالکل اُسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح سورہ عبس میں مرفوعہ، مکرمہ اور مطہرہ ہم معنی الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور یہاں یہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح حضرت مسیح کو خدا کی قربت کی عزت بخشی گئی ہے اُسی طرح مسیحیوں اور یہودیوں پر قیامت تک "تفوق" رہے گا۔

یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مسیحیوں اور یہودیوں میں جن باتوں میں اختلاف تھا اُن کا فیصلہ بھی قیامت کے دن خدا کرے گا۔ یعنی مسیحی حضرت مریم کو محصنہ مانتے تھے۔ یہودی اس کے منکر تھے اور اُن پر بہتان عظیم لگاتے تھے۔ اسی طرح مسیحی حضرت مسیح کو کلمۃ القاہا الی مریم (دیکھئے انجیل میں ورڈ آف گاڈ) کہتے تھے اور یہودی حضرت مسیح کو سچا مسیح نہیں مانتے تھے بلکہ باغی و کاذب بنا کر قتل کرا چکے تھے۔ اس کے علاوہ یہودی یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہوا کو کل قوموں کا خدا مانا جائے بلکہ وہ اسے اپنا مخصوص خدا سمجھتے تھے اور غیر قوموں اور غلاموں کو اپنے مخصوص خدا کی خدائی سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ان میں اکثر قیامت کے بھی قایل نہ تھے۔ خود مسیحیوں میں حضرت عیسیٰ اور اُن کی ماں کے متعلق عجیب و غریب اختلافات تھے غرضکہ یہودی اپنے احبار کو اور مسیحی حضرات مسیح و مریم کو ابن اللہ قرار دیتے تھے۔ قرآن نے اس کا انکار کیا کہ جسے موت آجائے وہ ابن اللہ یا اللہ کیسے ہو سکتا ہے۔

بہرحال جب یہ ثابت ہے کہ قرآن نے جزم کے ساتھ کہا ہے کہ حضرت مسیح نہ تو قتل کئے نہ صلیب پر چڑھائے گئے بلکہ رفع کئے گئے اور یقیناً قتل نہیں کئے گئے تو صاف ظاہر ہے کہ قتل کے معنی اس جگہ ذلیل کرنے کے اور رفع کے معنی معزز بنانے کے ہیں۔ یعنی اگرچہ مسیح بظاہر مصلوب ہو کر قتل یا ہلاک ہو گئے اور یہودیوں نے دو چوروں کے درمیان صلیب دیکر ہر طرح ذلیل بھی کرنا چاہا لیکن درحقیقت وہ قتل (ذلیل) نہیں ہوئے بلکہ اُن کا نام اور کام زندہ جاوید بنا دیا گیا۔ وہ اللہ کی راہ میں قتل (ہلاک) ہو کر شہید ہو گئے اور درحقیقت زندہ ہیں اور جنّت میں ہیں۔

"مقتولین فی سبیل اللہ" کے لئے قرآن نے بار بار یہی بتایا ہے کہ وہ جنّت میں زندہ ہیں اگرچہ قتل ہو چکے ہیں، مثلاً:-

(۱) والذین قتلوا فی سبیل اللہ فلن یضل
اعمالھم ٥ سیھدیھم و یصلح بالھم ٥ ویدخلھم
الجنۃ عرفھا لھم ٥

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے اُن کے اعمال بے راہ نہ ہوں گے۔ اللہ اُن کو ٹھیک راہ پر لائے گا اور وہ خوش ہو جائیں گے اور جس جنّت کو وہ انھیں بتا چکا ہے اُسی میں اللہ اُنھیں داخل کرے گا۔

(۲) فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین
یشرون الحیوۃ الدنیا بالآخرہ ٥

ومن یقاتل فی سبیل اللہ فیقتل او یغلب فسوف نؤتیہ اجراً عظیماہ (سورۂ نساء ۷۴)	جو کوئی اللہ کی راہ میں قتال کرنے کے بعد قتل ہو جائے یا مغلوب ہو جائے اُسے ہم اجر عظیم دیں گے

یہاں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مقتول فی سبیل اللہ کو اجر عظیم اس لئے ملے گا کہ وہ اللہ کی راہ میں قتل ہوا یعنی ما گیا۔ یہی حال مغلوب کا بھی ہوگا۔ پھر فرمایا:۔

این ماتکونوا یدرکم الموت ولوکنتم فی بروج مشیدّہ (نساء ۷۸)	یعنی موت (جسمانی) سے کوئی نہیں بچ سکتا خواہ وہ بروج مشیدہ ہی میں کیوں نہ ہو۔

اور اسی سلسلے میں ان موت سے ڈرنے والوں اور اللہ کی راہ میں قتل ہونے سے گھبرانے والوں سے کہا گیا کہ عجب ا ہے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ اللہ کی راہ میں مرنا اس دنیوی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے اور کہا کہ:۔

(فمالِ ھٰؤلاء القوم لا یکادون یفقہون قولا" نساء ۷۸) "اس قوم کو کیا ہوگیا ہے کہ اتنی سیدھی سادی بات یہ نہیں سمجھتے:۔

قرآن کا صریح ارشاد یہی ہے کہ مجاہدین فی سبیل اللہ جب مرجاتے ہیں تو دنیوی زندگی سے بہتر زندگی میں داخل ہو ہیں۔ یعنی اُن کی حالت بہت ارفع و بہتر ہو جاتی ہے۔ وہ ایسی زندگی ہوتی ہے جس پر ہزار دنیوی زندگیاں نثار کی جا سک ہیں، یہی تصور تھا کہ قرن اولیٰ میں مسلمانوں کا شوق شہادت اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ موت پر فتح پا چکے تھے اور دنیوی ز اُن کے سامنے ہیچ تھی۔

آخری سورۂ قرآن اور وفات مسیح

قرآن کی آخری سورت المائدہ ہے۔ اس سورہ میں اُن مجمل باتوں کی تفصیل پائی ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دولت اسلامیہ کتابیہ قائم ہے اور مومنوں کے لئے (جن میں اہلِ کتاب بھی داخل ہیں) ایک عالمی پروگرام رکھا گیا ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ زبان سے اقرار ہے کہ تو جانتا ہے میں نے یہ نہیں کہا کہ میری ماں اور میں معبود ہیں اور میرے مرنے کے بعد کی بھی تجھ کو خبر

ما قلت لھم اِلّا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربّی و ربکم وکنت علیھم شہیدا ما دُمتُ فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم ط وانت علیٰ کل شیٔ شہید۔ (المائدہ رکوع ۲)	میں نے اُن سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کا تو نے حکم نہ دیا ہو، یہ یہ کہ اس اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا دونوں کا آقا ہے جب تک میں اُن میں رہا میں اُن کی خبر رکھتا تھا) پھر جب تو مجھے وفات دے دی تو خود اُن پر نگران تھا، تو ہی ہر چیز سے خ ہے۔ (المائدہ۔ آخری رکوع)

یہاں صاف بتایا ہے کہ اللہ نے حضرت مسیح کو اُس زمانہ کے فوراً بعد جب وہ اُن میں نہیں رہے وفات دے دی ورنہ ح مسیح اگر خفیہ طور پر اُن میں موجود ہوتے تو یہ ہرگز نہ کہتے کہ "جب تو نے وفات دی" (فلما توفیتنی)

قرآن میں آسمان پر زندہ مع جسم کے لیجانے کا ذکر نہیں

وفات یعنی ممات مسیح کے متعلق لوگوں نے انجیل کے خلا یہ روایت بنائی ہے کہ حضرت مسیح کو خدا نے یہودیوں بچا لیا اور اُنھیں آسمان پر اُٹھا لیا۔ اس پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں:۔

(۱) خدا کی شان کے خلاف ہے کہ چند یہودیوں کو ہلاک اور جہنم واصل کرنے کی جگہ خود حضرت مسیح کو آسمان پر زندہ اُٹھا

(۲) قرآن میں آسمان پر زندہ اُٹھا لینے کا ذکر نہیں۔ اُس میں صرف یہ ہے کہ اپنے پاس رفع کر لیا۔ لہذا جو لوگ آسمان پ اٹھا لینا بیان کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ خدا زمین پر نہیں ہے۔ یہی عقیدہ یہود و مجوس کا تھا کہ خدا آسمان پر ہے۔ زمین

اُس کی حکومت نہیں ہے۔ اور جو مسیحی اب تک ملوکیت الٰہیہ کے تصور کو نہیں سمجھے وہ بھی یہی دعا کیا کرتے ہیں کہ "اے خدا جو آسمان پر ہے، تیری حکومت اس زمین پر بھی ہو" حالانکہ حضرت عیسیٰ یہی بتانے آئے تھے کہ " وسع کرسیہ السماوات والارض، وہ پوری کائنات کا خدا ہے، آسمان اور زمین دونوں کا مالک ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں تھی کہ خدا حضرت عیسیٰ کو آسمان پر بلاتا۔

(۳) بعض لوگ جو آسمان کے قایل نہیں وہ کہتے ہیں "رفع" سے مراد "بلند زمین" ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر مرے نہیں تھے۔ بلکہ نیم جاں ہو گئے تھے، اس لئے جب ہوش آیا تو اپنے حواریوں سے ملنے کے بعد فلسطین سے کوہ ہمالیہ کی بلندیوں کی طرف رخ کر دیا اور کشمیر میں جاکر وفات پائی۔ اور وہاں جو بوذا (سف) (بوذاسف) کی قبر مشہور ہے وہ ان ہی کی ہے۔

یہ باتیں نہ صرف [illegible] گھڑت ہیں بلکہ حضرت عیسیٰ کی شان رفیع کے بھی خلاف ہیں۔ جب انجیل (جسے ہر مسلمان کتاب اللہ مانتا ہے) یہ کہتی ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو شہید کر دیا اور تیسرے دن ایک فرشتے نے خبر دی کہ ان کو اللہ نے اُٹھا لیا۔ اور وہ اپنے حواریوں کو نظر آئے اور اب بھی زندہ (بطور شہید) موجود ہیں اور اپنے ماننے والوں کی پکار سنتے ہیں، تو یہ کہنا سراسر بے معنی ہے کہ وہ اپنے تبلیغی مشن اور فرض کو چھوڑ کر کسی بلند مقام کی طرف چل دئے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو خدا اُن کا وہی حال کرتا جو حضرت یونس کا کیا تھا، اور وہ کشتی میں فرار ہونے کی جگہ مچھلی کے ذریعے واپس ساحل پر لائے گئے تھے اور پھر نینوی والوں کے پاس دعوتِ حق کے لئے بھیجے گئے تھے۔

(۴) حضرت مسیح نے صرف تین سال تک "ملوکیتِ الٰہیہ" کی تبلیغ کی تھی، اس عرصے میں مکذبین اولی النعمۃ نے اُنھیں شہید کر دیا۔ ان کا مشن پورا بھی نہیں ہوا، حتیٰ کہ گیارہ حواریوں نے اُن کو پہچانا تک نہیں۔ اس حالت میں اگر وہ زندہ تھے تو اُنھیں اپنا مشن پورا کرنے کے لئے یہودیوں پر دوبارہ ظاہر ہو جانا تھا۔

دیکھئے رسول عربی صلعم پر بارہا مکہ میں دشمنوں نے حملہ کیا اور قتل کر ڈالنا چاہا۔ حتیٰ کہ غار ثور تک پہونچ گئے۔ پھر مسلسل مدینہ پر آنحضرت کو قتل کرنے کے لئے حملے کئے۔ کسی حال میں آپ نے اللہ سے یہ دُعا نہیں کی کہ اُنھیں آسمان پر اُٹھا لیا جائے۔ یا جب آپ غار ثور میں چھپے ہوئے تھے تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ خدایا مجھے آسمان پر اُٹھا لے، یا کسی بلند مقام (مثلاً کشمیر وغیرہ) بھیج دے کہ وہاں جاکر آرام کروں۔ مقابلہ سے ہٹ جانا اور اپنے فرض سے منھ موڑ لینا ایک معمولی انسان کے لئے بھی نامناسب ہے، چہ جائیکہ اللہ کے جلیل القدر رسول، اس امر کے مرتکب ہوں۔

غرضکہ محض "رفع" کے ناموزوں معنی سمجھنے اور "قتل" کے موزوں معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے ایسی روایتیں تصنیف کر لی گئی ہیں کہ ایک طرف تو حضرت مسیح اور خود خالق ارض و سما پر اعتراض وارد ہوتا ہے اور دوسری طرف "مہدی" کا تصور پیدا ہوتا ہے جو لاکھوں آدمیوں کو ایک امید موہوم کے سہارے رکھ کر "بے عمل" یا گریز پا بنا چکا ہے۔

سورۂ المائدہ کے شروع میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسیح ہرگز خدا نہیں ہیں اس لئے کہ خدا حی و قیوم ہے اور مسیح بشر ہیں اُنھیں موت مثل اور لوگوں کے آئے گی اور یہ ہلاکت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ خالق اور مخلوق میں یہی فرق ہے کہ خالق حی ہے اور مخلوق معرضِ فنا میں ہے اس سے نہ مسیح مستثنیٰ ہیں نہ مریم اس سے ثابت ہے کہ وہ معبود نہیں ہیں۔

"لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ہو المسیح ابن مریم قل فمن یملک من اللہ شیئاً ان اراد ان یہلک المسیح ابن مریم وامہٗ ومن فی الارض جمیعا۔	جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم خدا ہے وہ کافر ہیں۔ اگر خدا چاہے کہ مسیح بن مریم اور اس کی ماں (مریم) اور کل دُنیا والوں کو ہلاک کر دے، تو کون اللہ کی ملوکیت میں دخل دے سکتا ہے۔
(المائدہ ۱۷)	(المائدہ آیت ۱۷)
سی طرح فرمایا:- "کل نفسٍ ذائقۃ الموت"	ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا۔

اور یہ بھی کہا کہ:-

"این ما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدۃ"
(سورہ ۴: ۷۸)

تم جہاں کہیں بھی ہوگے خواہ بروج مشیدہ ہی میں کیوں نہ ہو، موت آنا برحق ہے۔

اور سورۂ مریم میں، جو کہ ہجرت حبشہ کے زمانہ میں مکی سورہ ہے اور تقریباً ۶ سنہ نبوی میں، یعنی ہجرت سے پانچ سال پہلے نا ہو چکی ہے صاف صاف ذکر ہے کہ جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو ان کی قوم (یہود) نے بچے کو گود میں دیکھ کر کہا:-

(یا مریم لقد جئت شیئاً فریاً ○ یا اُخت ہارون ما کان ابوک امرأ سوءٍ وما کانت اُمک بغیاً ○)

اے مریم تو ایک عجیب تہمت کی بات لائی ہے۔ تعجب اس لئے زیادہ ہے کہ تو شریف خاندان کی ہے اور تیرے ماں باپ بھائی سب اچھے لوگ اس پر حضرت عیسیٰ کی زبان سے یہ بتایا گیا ہے کہ میں "عبداللہ" ہوں (نہ کہ ابن اللہ، جیسا کہ نصرانیوں نے حضرت مریم کو باعصم مان کر اُن کا شوہر اللہ کو قرار دے دیا) مجھے احکام الٰہیہ پر (جو توراۃ میں ہیں) عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور میں انسان ہوں اللہ کی بندگی یعنی نماز اور اللہ کے عطا کئے ہوئے مال کی زکاۃ بھی مجھ پر زندگی بھر عاید ہوتی رہے گی" واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ ما دمت حیاً ○" (یہی نہیں بلکہ عام انسانوں کی طرح میں بھی پیدا ہوں، مروں گا اور (قیامت میں) دوبارہ پیدا کیا جاؤں گا "والسلام علیّ یوم ولدتُ ویوم اموتُ ویوم اُبعثُ حیاً" (حضرت مریم کے صدیقہ ہونے اور حضرت مریم کے بیٹے کے متعلق عبداللہ ہونے کا صاف صاف یہ حال ہے جس میں یہود کو شبہ تھا۔ قرآن نے اس شبہ کا ازالہ کر دیا)" ذٰلک عیسیٰ ابن مریم قول الحق الذی فیہ یمترون" کہ عیسیٰ بن مریم انسان ہیں، زندگی بھر خدا کے لئے نماز و زکات دیں گے، پھر وفات پائیں گے۔ (یعنی اگر وہ آسما پر زندہ ہیں تو نماز تو پڑھتے ہوں گے مگر زکات کیسے دیتے ہوں گے) یوم البعث کو دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ اگر وہ خدا ہو پھر وہ تو نہ پیدا ہوتے نہ وفات پاتے۔ اسی مناسبت سے سورہ آل عمران کے شروع میں جو آیتیں نصارائے نجران کو مخاط کر کے آنحضرت نے پڑھی تھیں یہ بتاتی ہیں کہ خدا حی و قیوم ہے مسیح نہیں ہیں وہ پیدا بھی ہوئے اور وفات بھی پا گئے۔

(الم اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم - آل عمران)

اور جس طرح بچپن (فی المہد) سے حضرت عیسیٰ نے نبوت کا کام شروع کر دیا تھا یعنی عبودیت خدا کی طرف بلانا شروع کیا تھا اسی طرح اسی سورہ مریم میں حضرت یحییٰ کا تذکرہ ہے کہ انہوں نے الکتاب یعنی توراۃ پر عمل کرنا اور اُس کے مطابق فیص (حکم) کرنا بچپن سے شروع کر دیا تھا (یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃٍ ط و آتیناہ الحکم صبیاً ○) اور پھر اُن کے پیدا ہونے ا وفات پانے اور دوبارہ قیامت میں عام انسانوں کی طرح مبعوث ہونے کا ذکر بالکل حضرت عیسیٰ کے ذکر کے مانند ہے ——

(وسلامٌ علیہ یومَ وُلِدَ ویومَ یموتُ ویومَ یُبعثُ حیاً ○ سورۂ مریم) غرضکہ حضرت عیسیٰ کی بھی ولادت و موت حضرت یحییٰ کی طر ہو چکی، قرآن شاہد ہے۔ بات یہ ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ کی بغیر باپ کے ولادت محیر العقول تھی اور یہود اس میں شک کرتے تھے اُس سے زیادہ حیرت انگیز حضرت یحییٰ کی ولادت تھی اس لئے خود اُن کے والد زکریا اتنے بوڑھے ہو گئے تھے ک اُن سے اولاد پیدا ہونا ناممکن تھا اور اُن کی بیوی بانجھ تھیں۔ ان دونوں مجبوریوں کے باوجود خدا نے اپنی قدرت سے اُنھیں بیٹا دیا۔ (کان امراتی عاقراً وقد بلغت من الکبر عتیاً) یہاں بھی وہی الفاظ ہیں جو حضرت عیسیٰ کی ولادت کے بارے میں ہیں (قال ربک ھو علیّ ھیّنٌ) یعنی یہ بات خدا پر بہت آسان ہے۔ اُس نے تو لاشئے سے کل کائنات پیدا کر دی۔

(وقد خلقتک من قبلُ ولم تک شیئاً ○ واذا ارادہ شیئاً یقول کن فیکون)

لہٰذا قتل کے معنی ذلیل کرنا، رفع کے معنی عزت دینا اور ولادت وفات کے مشہور معنی دونوں نبیوں کے لئے قرآن سے ثابت ہیں۔

اور قرآنی تلمیحات جو محاورۃً متضاد نہیں ہیں:- جس طرح قرآن نے قتل مسیح کو ما قتلوہ کہا ہے اور قتل کی حقیقت کے معنی وطہارت و اکرام کے بتائے ہیں اسی طرح قرآن میں کئی موقعوں پر اس طرزِ بیان کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً:-

(۱) "ما رمیت اذ رمیت ولاکن اللہ رمیٰ" (انفال) اے رسول تو نے نہیں مارا (اگرچہ تو نے ہی مارا) بلکہ اللہ نے مارا (غزوۂ بدر

(۲) "بصرتُ بما لم یبصروا بہٖ" (طٰہٰ-۹۶) سامری نے کہا کہ مجھے وہ بات سوجھی جو اسرائیلیوں کو نہیں سوجھی۔

(۳) "مثل الفریقین کالاعمیٰ والاصم والبصیر والسمیع ط ھل یستویان مثلاً ط افلا تذکرون" (؟) (سورۂ ہود رکوع ۲) یعنی
و مومن کی مثال ایسی ہے کافر آنکھوں کانوں کے باوجود اندھے اور گونگے ہیں۔ اسی طرح فرمایا:-

(۴) "لھم قلوبٌ لا یفقھون بھا، ولھم اعینٌ لا یبصرون بھا، ولھم آذانٌ لا یسمعون بھا۔ اولائک کالانعام، ہم اضل، اولائک ھم الغافلون ہ" (الاعراف ع ۲۲) یا

(۵) "افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوبٌ یعقلون بھا، او آذانٌ یسمعون بھا، فانھا لا تعمی الابصارُ ولاکن عمی القلوبُ التی فی الصدورِ"۔ (الحج ۶ ع ۴)

(۶) "والذین لا یؤمنون فی آذانھم وقرٌ (یعنی القرآن) علیھم عمیً اولائک ینادون من مکانٍ بعید"۔ (حم السجدہ - رکوع ۴)

خلاصہ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ جو بات استعارۃً کہی جاتی ہے، اور اس لئے کہی جاتی ہے کہ کلام میں زور پیدا ہو، اُسے اگر ہم زیور استعارہ سے محروم کر دیں تو پھیکی اور بے مزہ ہو جاتی ہے۔ جو لوگ کلام کی اس بلاغت سے واقف ہیں مجاز میں حقیقت اور تشبیہ و استعارہ میں حقیقت سے بلند تر حقیقت کو دیکھتے ہیں اور کبھی جسمانی موت کو فنا یا دل کے اندھے کو کور چشمی نہیں کہہ سکتے۔ وہ جانتے ہیں کہ خود رسول کریم کے سامنے کثرت سے لوگوں نے بدر و احد، خندق و حنین میں جام شہادت پیا۔ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے۔ دفن ہوئے اور اب تک اُن کو مقتول فی سبیل اللہ مانا جاتا ہے، لیکن کوئی یہ نہیں تا کہ وہ مر کر فنا ہو گئے۔ بلکہ قرآن کی تصریح کے مطابق وہ اسی طرح زندہ ہیں جس طرح کھانا کھانے والے جاندار مادی جسم کو انا کھلا کر زندہ رہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:-

(۱) ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتٌ ط بل احیاءٌ ولاکن لا تشعرون۔ (بقرہ ۱۵۳)

(۲) پھر مقتولین اُحد کے سلسلہ میں کہتا ہے کہ منافقین نے اپنے مقتول بھائیوں کے متعلق کہا کہ اگر وہ بھی ہماری طرح گھر رہتے اور ہمارا کہا مانتے تو قتل نہ ہوتے۔ اے رسول اِن منافقوں سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت کو ٹال دو۔ (الذین قالوا لاخوانھم وقعدوا لو اطاعونا ما قتلوا ط فادرؤا عن انفسکم الموت ان کنتم صادقین - آل عمران ۱۶۸)۔

یہاں شہدائے اُحد کے لئے قتل بمعنی موت استعمال ہوا ہے۔ اسی کے آگے جو آیت ہے اُس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں مرنے والوں کو مُردہ نہ سمجھو (ولا تحسبنّ الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً ط بل احیاءٌ عند ربھم یُرزقون
فرحین بما آتاھم اللہ من فضلہٖ لا . . . . . یحزنون ۞ (آل عمران)

اب بتائیے کہ ہم حضرت مسیح بن مریم کو مقتول فی سبیل اللہ (شہید) سمجھیں یا نہ سمجھیں؟ قرآن کی تعلیم کو بحیثیت مجموعی جائے تو اس میں کوئی ابہام نہیں۔ حضرت مسیح ضرور شہداء میں سے ہیں اور اگر وہ دوبارہ آسمان سے اُتر کر یہاں نے والے اور وفات پانے والے ہیں، تو اُن لوگوں کو انتظار کا حق ہے، جو قوم موسیٰ کی طرح چاہتے ہیں کہ سب کچھ وہی کر دیں یہ بیٹھے کہتے رہیں (انا ھٰھنا قاعدون)

محمد اجمل خاں (دہلی)

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

ہیراطیقی رسم خط ہیروغلیفی نقوش عام طور سے عمارتوں پر کندہ کئے جاتے تھے لیکن جب روزانہ زندگی کے معمولات اور اظہار خیال کے لئے انھیں پیپرس پر لکھا جانے لگا تو عرصہ تک وہ اپنی خوبصورتی باقی نہ رکھ سکے اور تصویری حروف کی صورتیں مسخ ہونے لگیں اور اس مسخ شدہ نئی لکھائی کو "ہیراطیقی" کہتے ہیں۔

لفظ ہیراطیقی محرب ہے انگریزی (HIERATIC) کا جو یونانی لفظ (HIERATIKOS) سے ماخوذ ہے یہ نام کلمینٹ اسکندری نے اپنے زمانہ کی اُس مصری لکھائی کے لئے استعمال کیا ہے جو پروہتوں میں رائج تھی اور اس کے معنی ہیں "مقدس۔ پروہتوں کا"۔

ہیروغلیفی اور ہیراطیقی میں وہی فرق ہے جو انگریزی کے چھپے اور لکھے ہوئے حروف میں یا نستعلیق اور خطِ شکستہ میں ہے۔ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ تصویروں کا تصویرپن غائب ہوگیا، نیچے ہیراطیقی رسم خط کی ایک عبارت معہ ہیروغلیفی اصل کے درج کی جاتی ہے جن سے آپ دونوں کا فرق سمجھ سکتے ہیں۔ لکھائی کا رُخ دائیں سے بائیں کو ہے۔

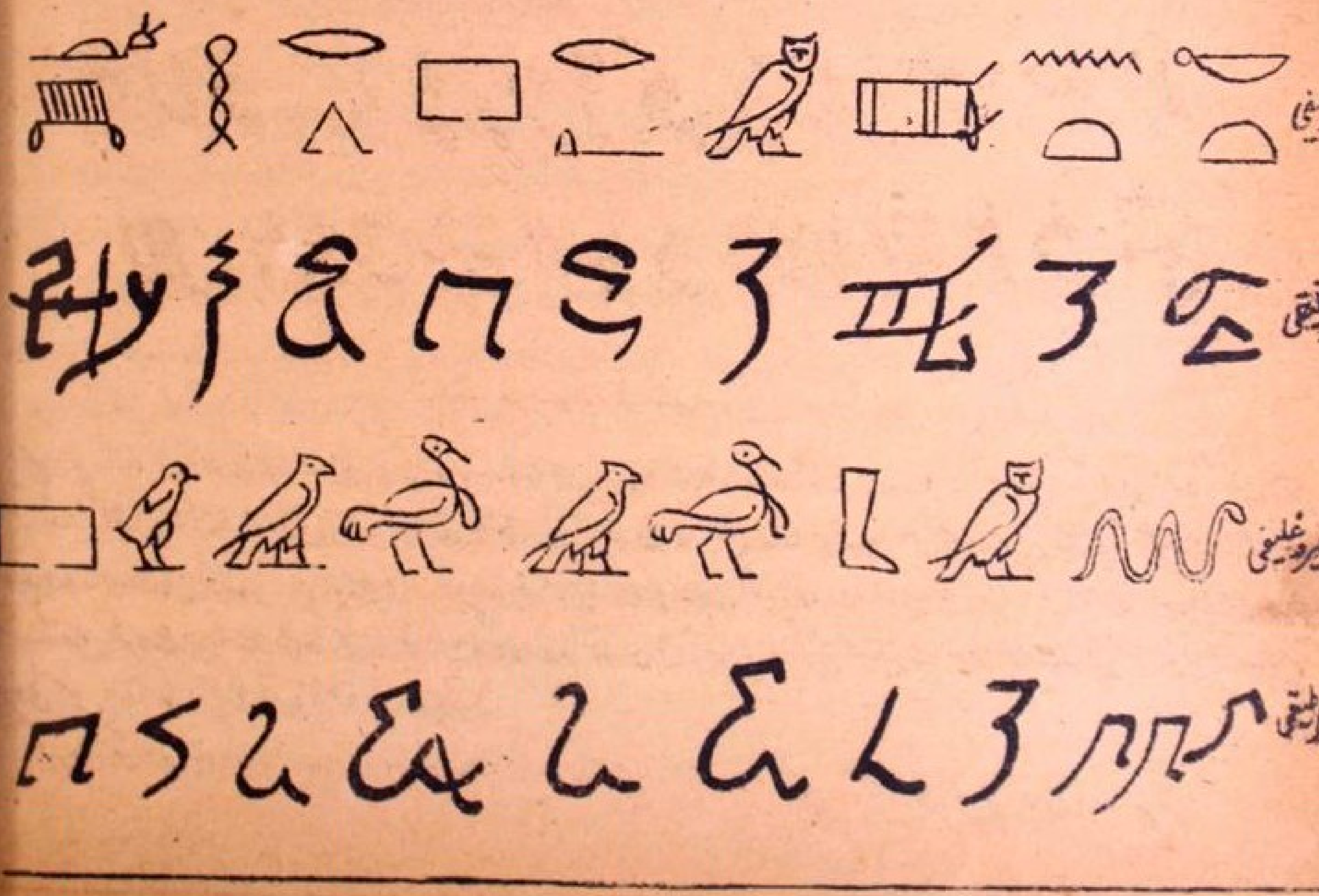

پہلے ہیراطیقی رسم خط اوپر سے نیچے کو لکھا جاتا تھا لیکن بعد میں دائیں سے بائیں کو لکھا جانے لگا۔ جہاں تک قدامت کا تعلق ہے ہیراطیقی م خط ہیروغلیفی سے کچھ ہی کم پرانا ہے، دونوں بہ یک وقت رائج تھے۔ تقریباً ۳۰۰۰ سال مستعمل رہ کر تیسری صدی عیسوی سے اس کا استعمال د ہوگیا

یموطیقی رسم خط مصری عوام کی لکھائی پروہتوں سے جدا تھی۔ ہیروڈوٹس اور ڈیوڈورس نے اسے (GRAMMATA DEMOTIKA) یعنی "عوامی یا جمہوری لکھائی" کہا ہے۔ اس سے انگریزی نام (DEMOTIC) وذ ہے۔ جس کی معرب صورت "دیموطیقی" ہے۔

یہ لکھائی ہیراطیقی نشانات کے مزید اختصار سے پیدا ہوئی تھی۔ اسے ایک قسم کی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کہنا چاہئے۔ ہیراطیقی طرح اسے بھی پیپرس پر لکھا جاتا تھا۔ لکھائی کا رُخ دائیں سے بائیں کو ہے۔ اس کے قدیم ترین نمونے ساتویں صدی ق۔م ہیں اور سب سے آخری سنہ ۴۵۲ء کا۔

مصر کے یونانی حکمرانوں کے زمانہ میں اس لکھائی نے بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ چنانچہ "کتبہ روزیٹا" (جس کا ذکر آگے آئیگا) "فرمانِ کینوپس" پر ہیروغلیفی کے بعد دوسری جگہ اسے اور تیسری جگہ یونانی کو دی گئی ہے۔

دیموطیقی مخطوطات کو پڑھنے میں بہت دقت ہوتی ہے۔ ہر کاتب کا ہاتھ دوسرے سے جدا اور ہر پیپرس کی لکھائی دوسرے ختلف ہے۔ انھیں پڑھنے کے لئے بڑی محنت اور مشق کی ضرورت ہے۔ اور چونکہ دیموطیقی مخطوطات کے موضوع غیر دلچسپ ہیں ارتی اور قانونی معاملات وغیرہ) اس لئے انھیں پڑھنے کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔

دیموطیقی رسم خط کا نمونہ یہ ہے:۔

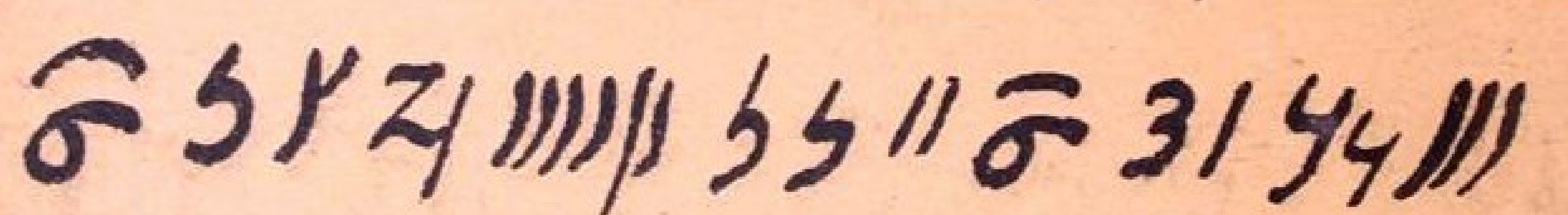

ر کی لکھائی مصر کے جنوب میں نوبیا کا ملک ہے جس کا دارالحکومت زمانۂ قدیم میں میرو کا شہر تھا۔ نوبیا مصر کے زیر تابع تھا۔ نویں آٹھویں صدی ق۔م اس نے آزادی حاصل کرلی، لیکن وہاں کے لوگ مصری زبان اور سم خط استعمال کرتے رہے یہاں تک کہ ولادت مسیح سے کئی صدی قبل مصری زبان بھی ترک کردی گئی اور مقامی زبان ستعمال شروع ہوا جسے لکھنے کے لئے تیسری یا دوسری صدی ق۔م ایک نیا رسم خط ایجاد ہوا جسے میرو کی رعایت سے ہم وئی" (MEROITIC) کہہ سکتے ہیں۔

میروئی کی دو قسمیں ہیں تصویری اور تحریری۔ اس کے حروف یہ ہیں:۔

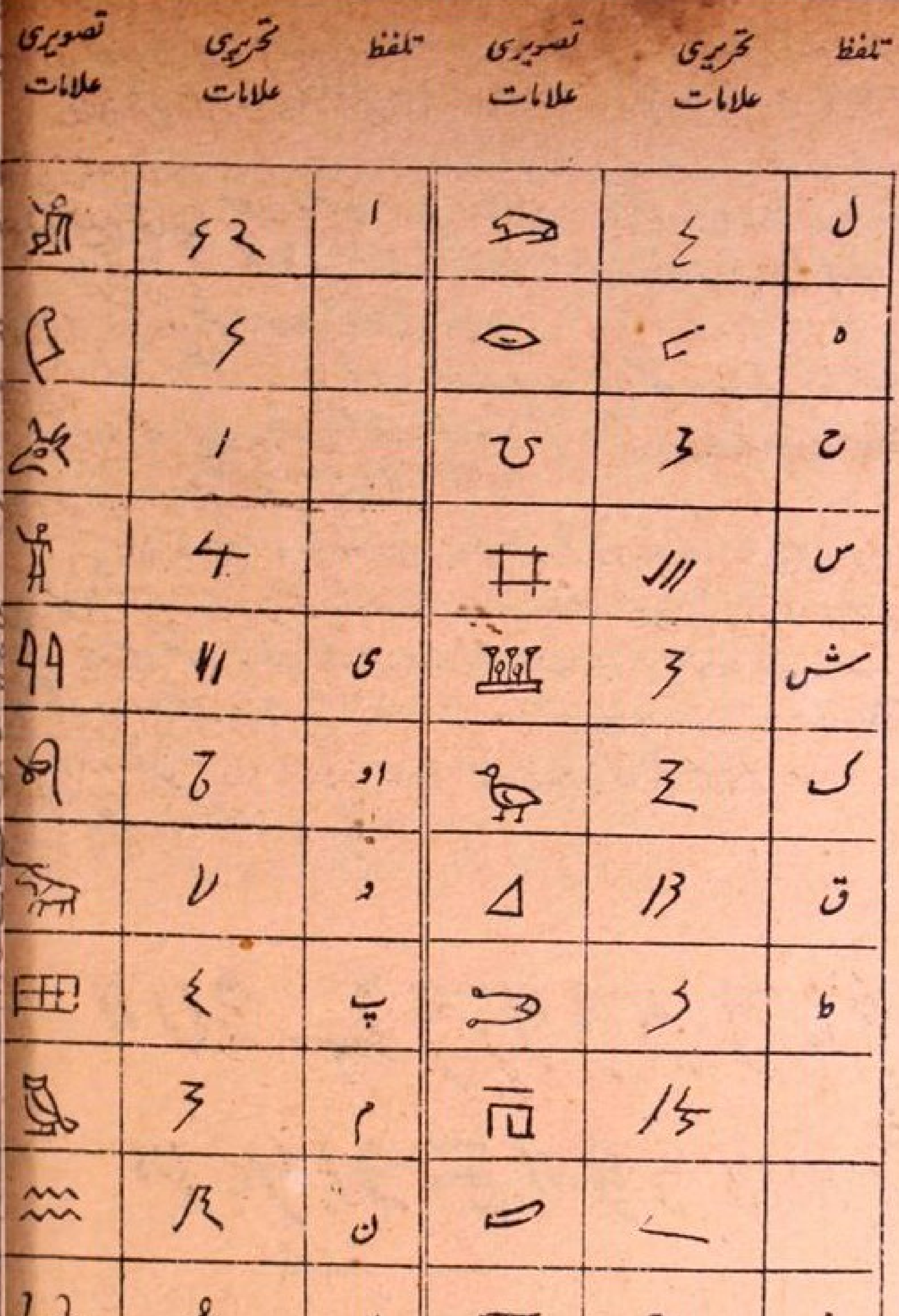

تلفظ	تحریری علامات	تصویری علامات	تلفظ	تحریری علامات	تصویری علامات
ل			ا		
ہ					
ح					
س					
ش			ی		
ک			او		
ق			و		
ط			پ		
			م		
			ن		
ز			ن		
			ر		

تصویری علامتیں ہیروغلیفی رسم خط سے ماخوذ ہیں۔

تحریری علامتوں کا ماخذ ڈیموطیقی رسم خط معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اُس کے مقابلہ میں میروئی علامتیں زیادہ مختصر ہیں۔

کتبۂ روزیٹا مصری رسم خط کے اصول وقواعد وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُسے پڑھا کیسے گیا؟ جبکہ تیسری صدی عیسوی سے اُس کا استعمال بند ہوگیا تھا اگرچہ پُرانے محلوں، مندروں اور مقبروں پر تصویری رسم خط میں کتبے موجود تھے لیکن کسی کو بھی نہ معلوم تھا کہ اُن میں کیا لکھا ہے یہ کیفیت ۱۵۰۰ سال تک رہی یہانتک کہ قدیم مصری رسم خط کی کنجی کتبۂ روزیٹا کی شکل میں مل گئی۔

روزیٹا ایک مقام کا نام ہے جو اسکندریہ سے چند میل جانب مشرق واقع ہے۔ ۱۷۹۹ء کا واقعہ ہے کہ نپولین نے مصر پر حملہ کیا۔ اُس کے توپخانہ کا ایک افسر بوسارڈ (BOUSSARD) روزیٹا میں سینٹ جولین کے قلعہ کی ایک دیوار کھدوا رہا تھا کہ یکایک کھودنے والوں کی نظر ایک سیاہ پتھر پر پڑی جس پر عجیب وغریب نشانات تھے۔ سپاہیوں نے یہ پتھر اپنے افسر کو دکھایا۔ بوسارڈ نے اُسے مضبوط اور پاکر اُن عالموں کے حوالے کردیا جو نپولین کے ساتھ آئے تھے اور جب ۱۸۰۱ء میں فرانسیسیوں نے شکست کھائی تو یہ کتبہ انگریزو ہاتھ آیا۔ مصر سے اُسے انگلستان لے آئے اور برٹش میوزیم (لندن) میں رکھدیا۔

اس کتبہ کی لمبائی ۳ فیٹ ۹ انچ، چوڑائی ۲ فیٹ ۴ ½ انچ اور موٹائی ۱۱ انچ ہے۔ اس کے اوپر کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا ہے

سی طرف نیچے کا کچھ کونا بھی اس کے نقوش ہیروغلیفی دیموطیقی اور یونانی تین طرح کے رسم خط سے تعلق رکھتے ہیں، اوپر کی ۱۴ سطریں ویری حروف میں ہیں، درمیان کی ۳۲ سطریں دیموطیقی رسم خط میں اور نیچے کی ۵۴ سطریں یونانی حروف میں۔

یونانی تحریر کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ اس کتبے کو بطلیموس پنجم مسمّی ایپیفانیس (PTOLEMY V EPIPHANES) ۹۲ - ۱۹۰ اق۔م کندہ کروایا تھا۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ تینوں کتبوں کا مضمون ایک ہے صرف زبان اور لکھائی کا فرق ہے۔ یونانی خط معلوم تھا لہٰذا سب سے پہلے اُسے پڑھا گیا۔ اس کے بعد دیموطیقی اور ہیروغلیفی رسوم خط کے کتبے پڑھے گئے۔

ہیروغلیفی رسم خط کے پڑھنے میں دو چیزوں سے بڑی مدد ملی ایک تو قبطی زبان جو قدیم مصری سے نکلی ہے اور دوسرے مصری خط کی یہ خصوصیت کہ اُس میں بادشاہوں کے نام ایک خاص قسم کا حلقہ بنا کر لکھے جاتے ہیں جنھیں جدید اصطلاح میں "کارتوس"[1] ے ہیں۔

۱۸۱۴ء میں مشہور سائنسداں ڈاکٹر ٹامس ینگ نے کتبۂ روزیٹا کے ہیروغلیفی حصے میں اُس حلقے کو معلوم کر لیا جس میں بطلیموس نام تھا لیکن وہ اُس میں آنے والی تصادیر کی ٹھیک ٹھیک آوازیں متعین نہ کرسکا۔

اسی اثناء میں ایک دوسرا فرانسیسی عالم جین فرینکوئس شمپولین بھی کتبۂ روزیٹا کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے منے کتبۂ روزیٹا کی نقل کے علاوہ جزیرہ فلائی کے ایک مخروطی مینار پر پائے جانے والے دو کارتوسوں کی نقلیں تھیں۔ اس مینار نیچے کے حصے میں ایک یونانی کتبہ تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ مینار بطلیموس اور قلوپطرہ سے منسوب ہے۔ اب ان میں سے ایک حلقے کے نقوش کتبۂ روزیٹا کے حلقہ کے نقوش سے ملتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں بطلیموس کا نام تھا اور یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات کہ مینار کے دوسرے حلقے میں قلوپطرہ کا نام تھا۔ جب ان ناموں میں آنے والے رومن حروف کی گھیروں میں آنے والی تصادیر تطبیق کی گئی تو اتفاق سے پوری اُتری اور اس طرح مصری ہیروغلیفی حروف میں سے کئی کی آوازیں معلوم ہوگئیں۔

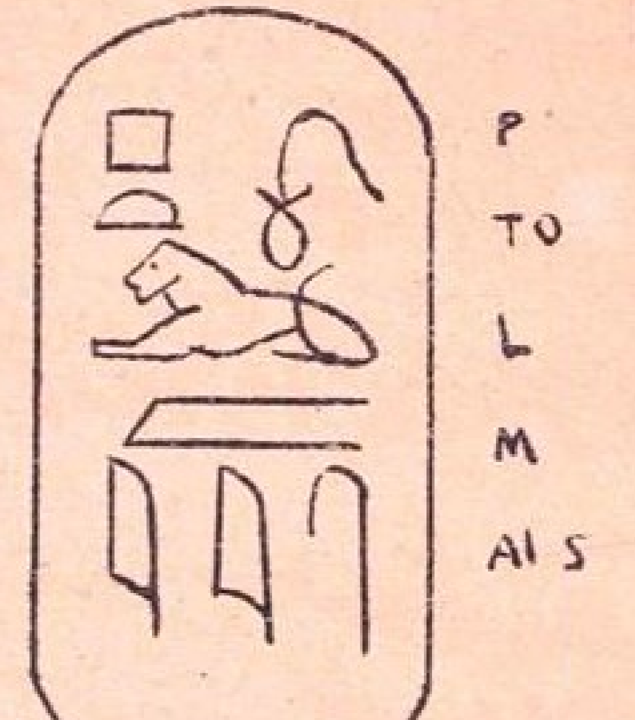

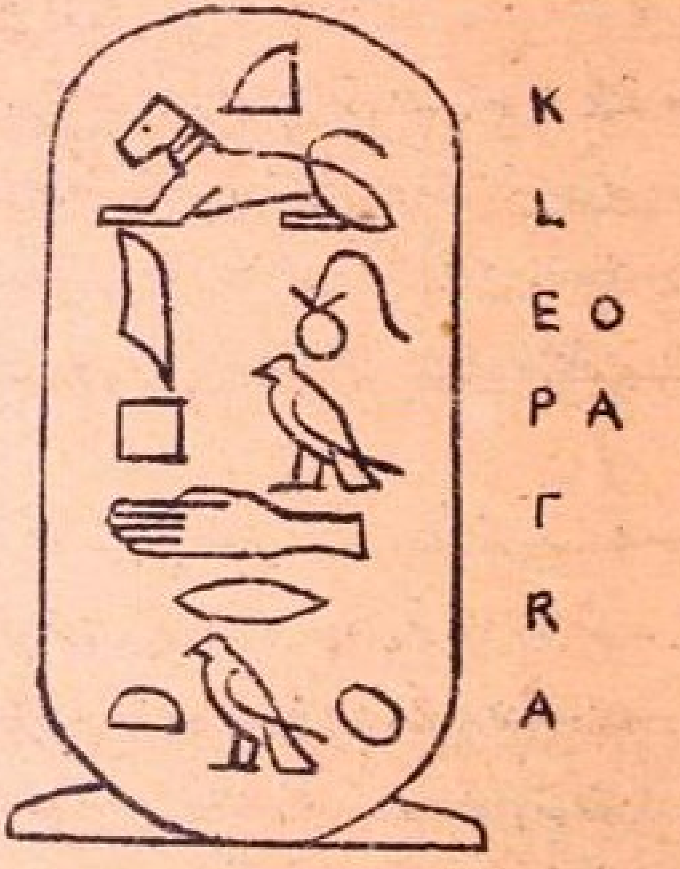

اسی طرح اُس نے مصر کے ۷۹ یونانی اور رومی حکمرانوں کے نام پڑھ ڈالے۔

---

[1] یعنی یہ شکل ▭ میرے خیال میں یہ انگوٹھی ○ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ انگوٹھیوں پر نام کندہ کرا کے مُہر کے طور پر ثبت نے کا طریقہ بہت پُرانا ہے۔

۱۴ر ستمبر ۱۸۲۲ء کو اُسے دو اور مندروں پر پائے جانے والے کارتوسوں کی نقلیں ملیں:-

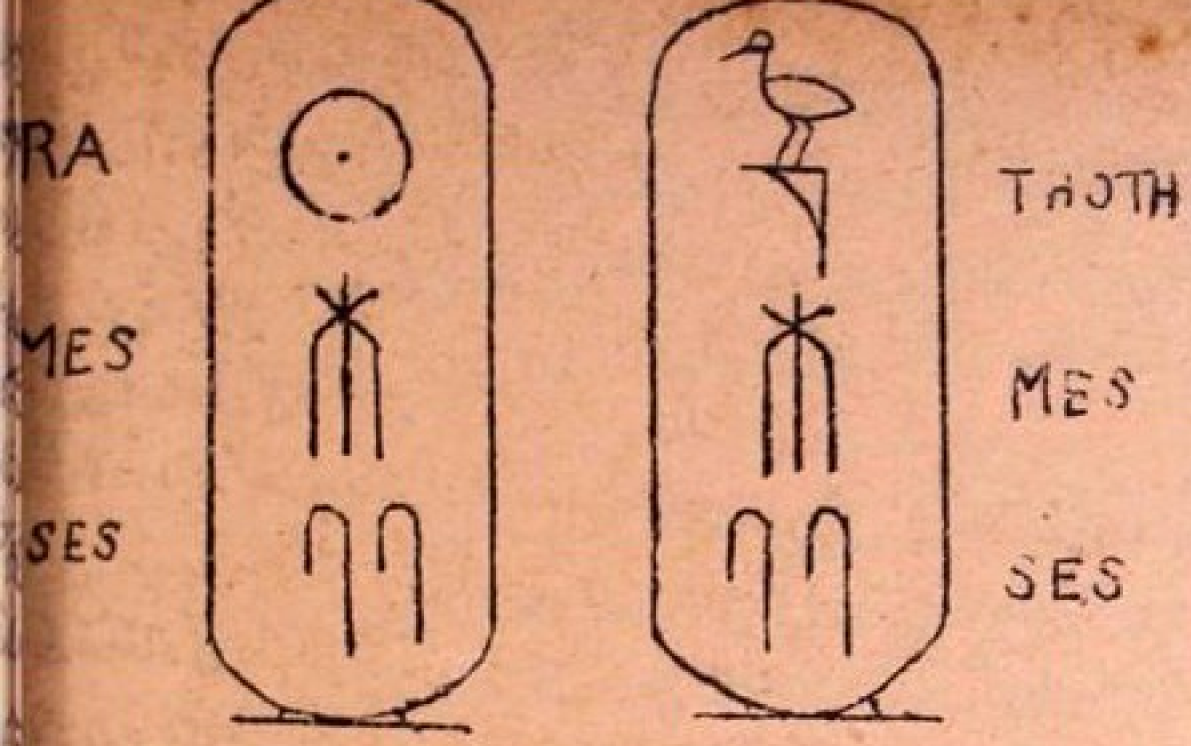

ان میں سے ایک میں اوپر کی طرف (بائیں جانب والا نقش) سورج کی تصویر تھا جسے قبطی زبان میں "را" کہتے ہیں۔ بیچ کا نشان کتبۂ روزیٹا میں بھی پایا جاتا تھا جہاں وہ پیدائش کے معنی دیتا تھا اور قبطی زبان میں "میس" کے معنی پیدا ہونا اور "ماس" کے معنی بچے کے ہیں۔ سَ کے نشانات جو آخر میں ہیں اُسے پہلے ہی سے معلوم تھے۔ اس طرح یہ بات ظاہر ہوگئی کہ یہ "رامیسیس" کا نام ہے اور اس کے معنی ہیں "(سورج دیوتا) را کا بیٹا"۔

دوسرے کارتوس میں اوپر (IBIS) نامی پرند کی تصویر تھی۔ یونانی تحریروں سے معلوم ہوا کہ یہ پرند تھاتھ دیوتا کی علامت تھا۔ بقیہ علامتیں وہی ہیں جو پہلے کارتوس میں ہیں اسے "تھاتھ موسیس" پڑھا گیا بمعنی "تھاتھ (دیوتا) کا بیٹا"۔ چونکہ یہ نام یونانی مورخ (MANETHO) کی تاریخ میں بھی پایا جاتا ہے لہذا اس کے صحیح ہونے میں شبہ نہ رہا۔

اب اُسے یہ معلوم ہوگیا کہ مصری ہیروغلیفی رسم خط میں تین طرح کے نشانات کام آتے تھے۔ (۱) تصویری الفاظ جیسے "را" ا "تھاتھ" وغیرہ۔ (۲) دو حرفی کلمات جیسے "میس"۔ (۳) یک حرفی کلمات یا حروف جیسے پ۔ ت۔ ل۔ م۔ وغیرہ۔

۱۷ر ستمبر ۱۸۲۲ء کو اُس نے مصری حروف تہجی کا ایک نقشہ مرتب کرکے پیرس کی (ACADEMIE DES INSCRIPTIONS) کو پیش کیا اور اب اُسے مصری ہیروغلیفی رسم خط پر اتنا عبور ہوگیا تھا کہ وہ اُسکے کتبات پورے وثوق کے ساتھ پڑھنے لگا۔ اُس نے کتبۂ روزیٹا کے کافی حصہ کو پڑھ ڈالا لیکن اُس کی زندگی نے وفا نہ کی اور ۴ر مارچ ۱۸۳۲ء کو اُس کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کام کو اُس کے بیٹے نے پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ کتبۂ روزیٹا کا ترجمہ ۱۸۴۱ء میں شایع ہوا۔ شمپولین کو صحیح معنوں میں "مصریات کا باپ" کہا جاتا ہے۔ ہیروغلیفی رسم خط کے پڑھنے میں اُس کا وہی مقام ہے جو سر ہنری راولنسن کا میخی رسم خط کے پڑھنے میں۔

وادیِ سندھ کا رسم خط

آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے یہ ثابت ہے کہ زمانۂ قدیم کی وادیِ سندھ ایک تہذیب کا مرکز تھی اور اپنی معاصر سمیری اور مصری تہذیبوں سے کسی طرح پیچھے نہ تھی۔ یوں تو وادیِ سندھ میں کئی پرانے شہر کھود کر نکالے گئے ہیں لیکن اُن میں سے دو بہت مشہور ہیں ایک ہڑپّا (ملتان اور لاہور کے درمیان) اور دوسرا موہنجوداڑو (مردوں کا ٹیلہ) ضلع لاڑکانہ صوبۂ سندھ میں۔ سر جان مارشل کے مطابق اس تہذیب کا مرکزی زمانہ ۳۲۵۰ لغایت ۲۷۵۰ ق م ہے۔

کتبے۔۔ وادیِ سندھ کے کتبے بہت چھوٹے ہیں وہ عموماً چوکور چپٹی مہروں (STAMP SEALS) کی شکل میں پائے جاتے ہیں جن کے درمیان کسی جانور کی تصویر ہوتی ہے اور اوپر کے حصے میں تصویری لکھائی۔ یہ مہریں ایک خاص قسم کے پتھر کی ہیں جسے (STEATITE) کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ پیتل کی چھوٹی چھوٹی تختیاں بھی ملی ہیں جن کے ایک رخ پر کسی جانور کی تصویر ہوتی ہے اور دوسرے رخ پر کتبہ۔

حیوانی تصاویر کے علاوہ بعض دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سب سے خاص شیوجی کا "پشوپتی روپ" ہے

ں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہروں اور پیتل کی تختیوں کو مذہبی اہمیت حاصل تھی اور ممکن ہے اُنھیں تعویز کی طرح پہنا جاتا ہو۔

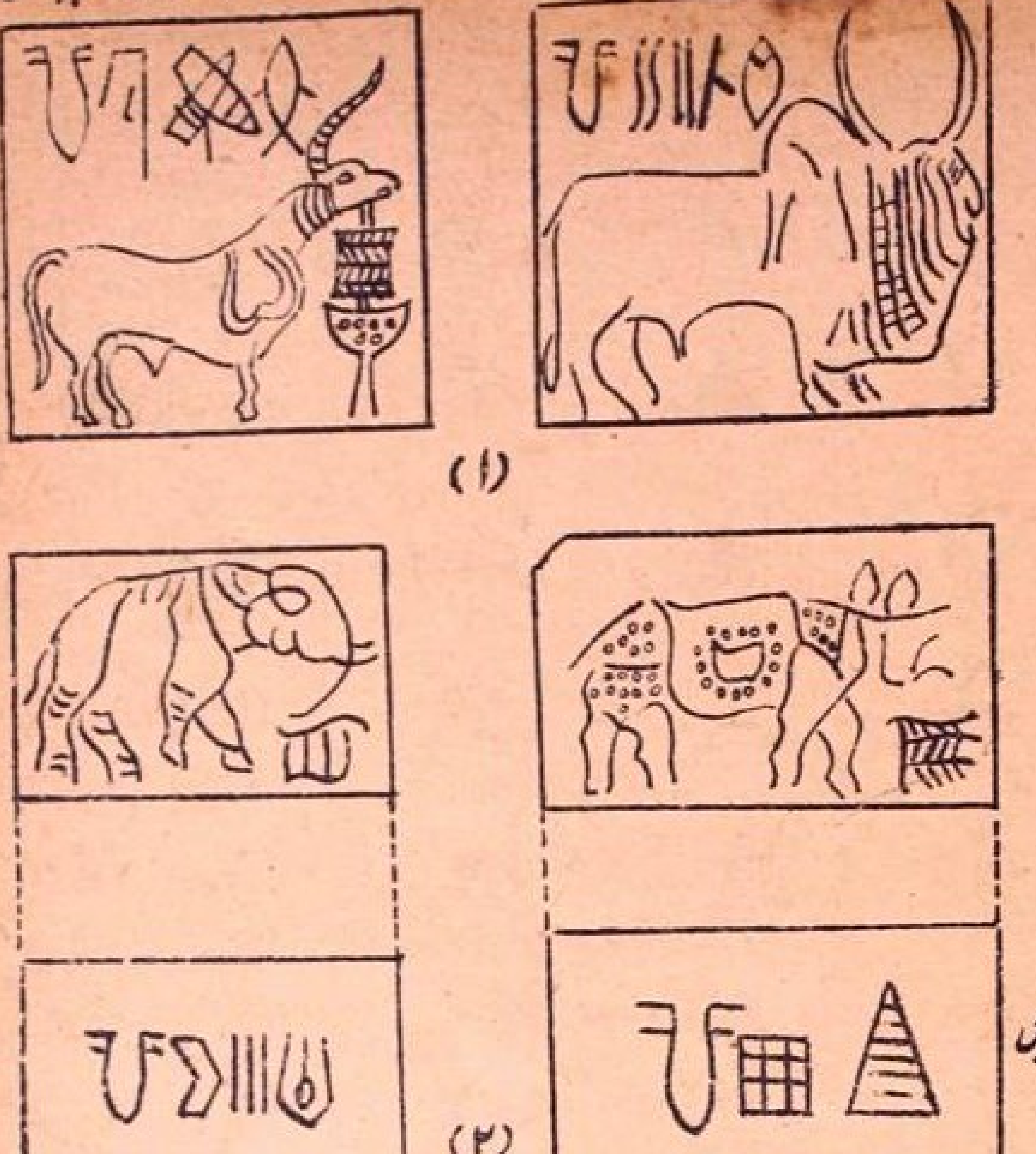

موہنجو داڑو اور ہڑپا کے کتبے
نمبر(۱) پتھر کی مُہریں - نمبر(۲) پیتل کے تعویذ

اس رسم خط کا ابھی تک کوئی ویل کتبہ نہیں ملا ہے غالباً اس لئے کہ ھیں ایسی اشیاء پر لکھا جاتا تھا جو یادہ دیرپا نہیں ہوتیں مثلاً بھوج پتر ور کے پتے۔ چمڑا (PARCHMENT ڑی اور سوتی کپڑا وغیرہ۔ اُس کے بعض نشانات اتنے مختصر ہیں کہ صورت کا پہچاننا ی مشکل ہے۔ چونکہ مختصر نویسی فنِ تحریر ے ارتقاء کی دوسری منزل ہے اسلئے ہیں وادیِ سندھ کے رسم خط کے نمو و ارتقاء کا ایک طویل دور تسلیم کرنا ا لیکن عبوری دور کا کوئی کتبہ نہیں ملا س کا سبب یہ ہے کہ وہ آسانی سے ڑ گل جانے والی چیزوں پر لکھے گئے تھے اور فنا ہو چکے ہیں

تبات کی لکھائی

نانات کی تعداد — اس لکھائی کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کتنے نشانات کام آتے تھے لٹر ہنٹر ۲۵۳ نشانات ظاہر کرتے ہیں۔ پروفیسر اسٹیفین لینگڈن ۲۸۸ اور سی۔ جے گڈ اور سڈنی اسمتھ ۳۹۶۔ لیکن میرا زہ اس سے کہیں زیادہ کا ہے۔ سرجان مارشل نے اپنی کتاب میں موہنجو داڑو کی تقریباً ۵۰۰ مہروں کے فوٹو دئے ہیں، اور ھو سروپ وٹس نے اپنی کتاب میں ہڑپا کی تقریباً ۹۰۰ مہروں کے۔ ان ۱۴۰۰ مہروں کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد میں نے وادی ھ کے رسم خط میں کام آنے والے نشانات کی جو فہرست اپنے ذاتی استعمال کے لئے مرتب کی ہے اُس میں تقریباً ۷۵۰ اندراج اگرچہ ان میں سے بعض نشانات ایک ہی نشان کی بدلی ہوئی صورتیں (VARIANTS) ہیں۔ ہمارے پاس یہ معلوم نے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وادیِ سندھ کے لوگ کن نشانات کو مفرد مانتے تھے اور کن کو مرکب۔ ایک ہی نشان مختلف طرقول بنایا جاتا تھا یا ذرا سا فرق کر دینے سے اس کے معنے میں تغیر ہو جاتا تھا۔

اس کے علاوہ چونکہ مہروں پر پائے جانے والے کتبات یا تو مالکوں کے نام ہوں گے یا دیوی دیوتاؤں کے اس لئے ظاہر کہ اُن میں خاص قسم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں گے اور زبان کا ایک محدود حصّہ ہیں۔ دوسرے مضامین کے لئے دوسرے ظا اور دوسرے نشانات کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس رسم خط کے طویل کتبے دستیاب نہیں ہوئے جن سے رسم خط کے نشانات پر پوری روشنی پڑتی۔

تات کی قسمیں — اس لکھائی میں کام آنے والے نشانات کی زیادہ قسمیں نہیں ہیں، اُن میں سے تو بعض کے بارے بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چیز کی تصویریں ہیں۔ لیکن آدمیوں، جانوروں، پرندوں، مچھلیوں، کیکڑے اور پہاڑ وغیرہ

کی تصاویر کو بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے مثلاً :-

نامعلوم	نامعلوم	علم ؟	پہاڑ	مچھلیاں اور کیکڑے	پرند اور دوسرے جانور	انسان
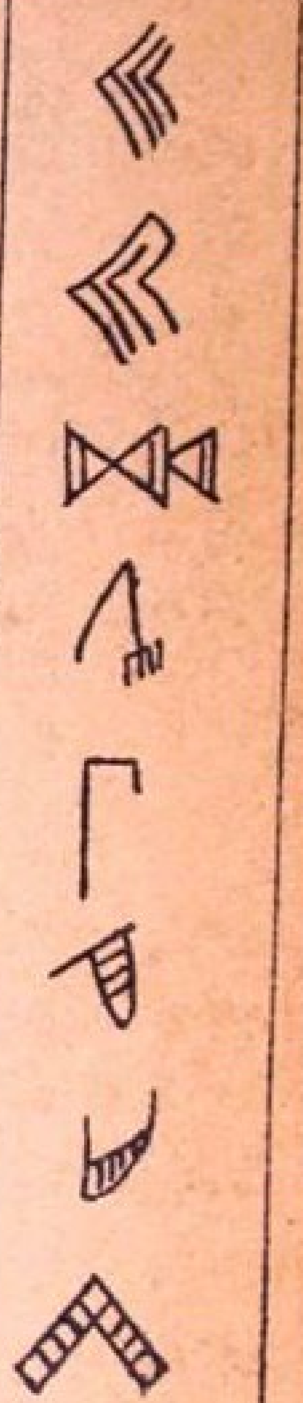	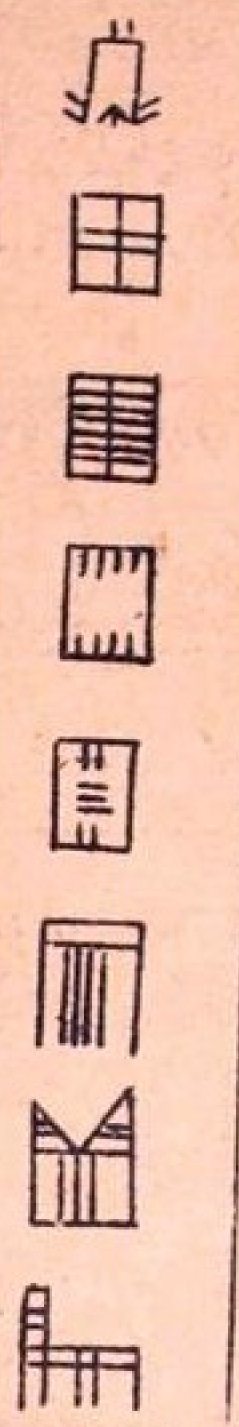	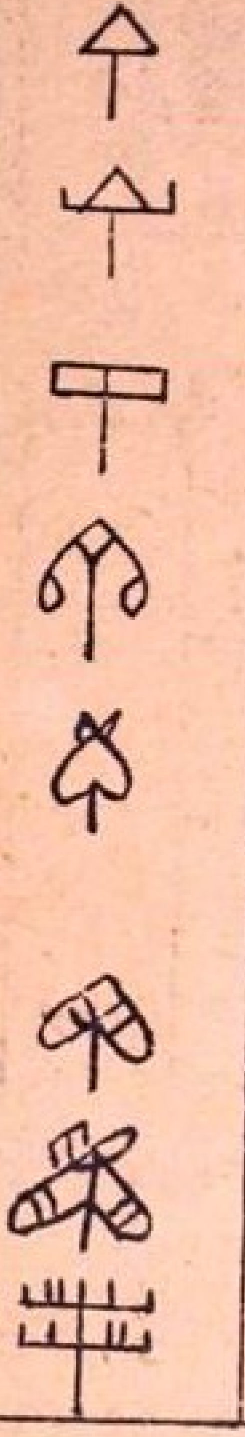	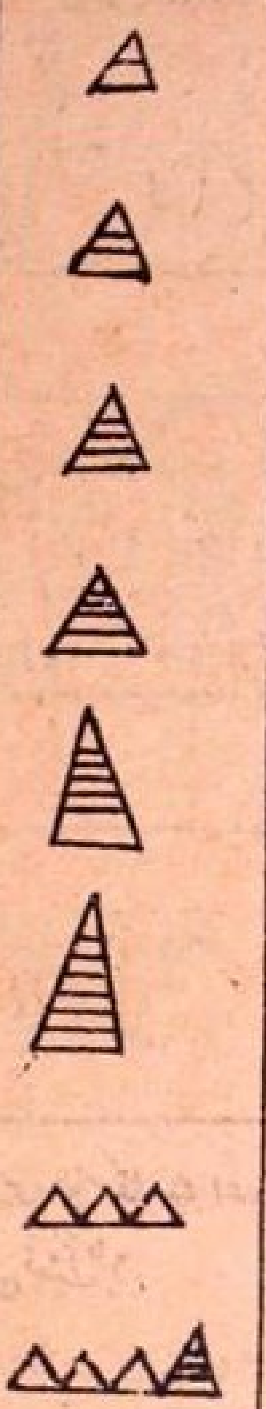	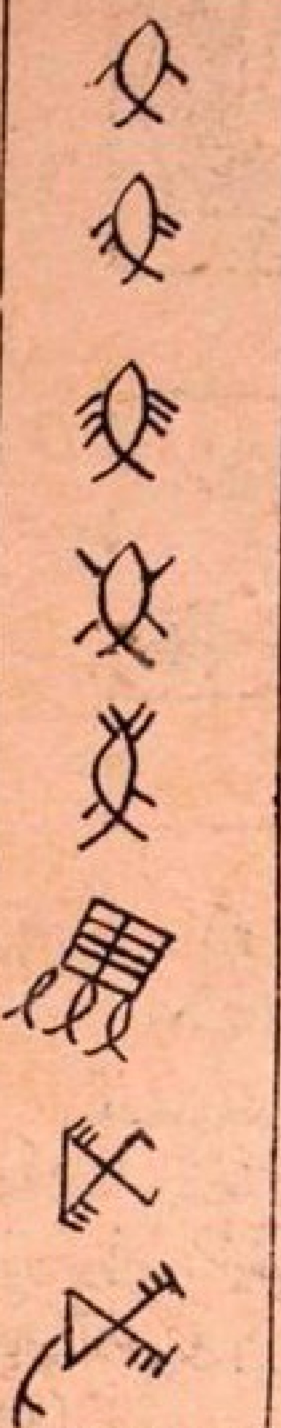	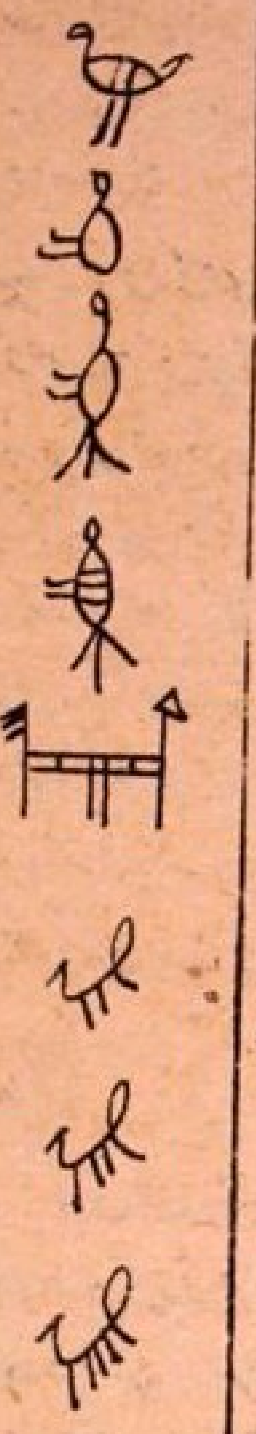	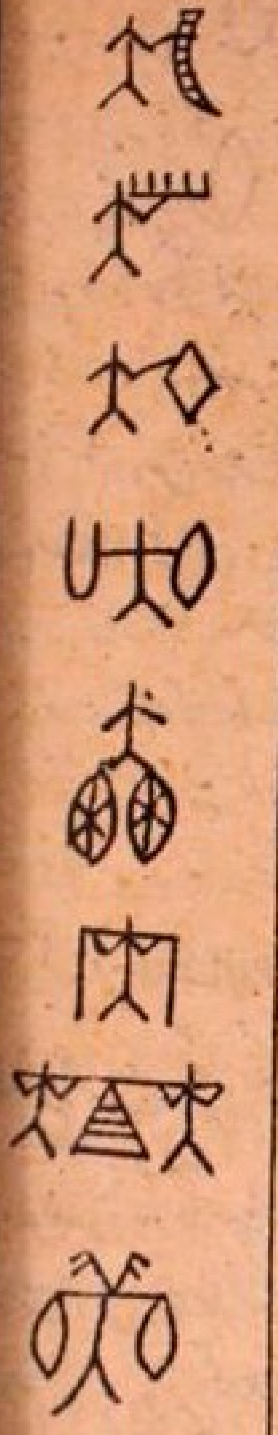

کچھ نشانات خاص قسم کی لکیروں اور قوسین میں بند کئے جاتے ہیں مثلاً :-

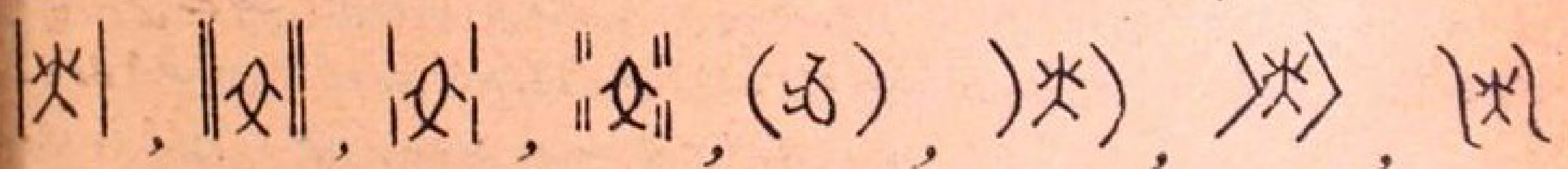

بعض نشانات کے اندر کچھ لکیروں کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے :-

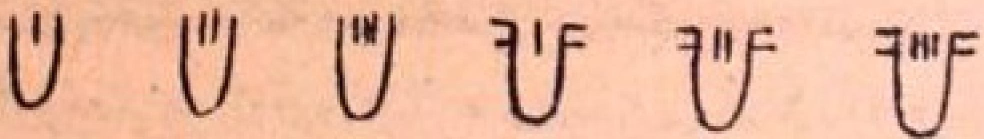

اور بعض میں باہر کی طرف جیسے :-

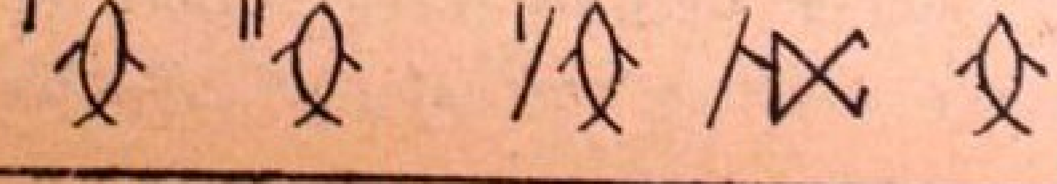

ممکن ہے یہ براہمی اور دیوناگری رسوم خط کی ماتراؤں (اعراب) کی صورتیں ہوں۔

بہت سے نشانات مرکب ہیں جن کے اجزائے ترکیبی کو علٰحدہ کیا جاسکتا ہے جیسے:۔

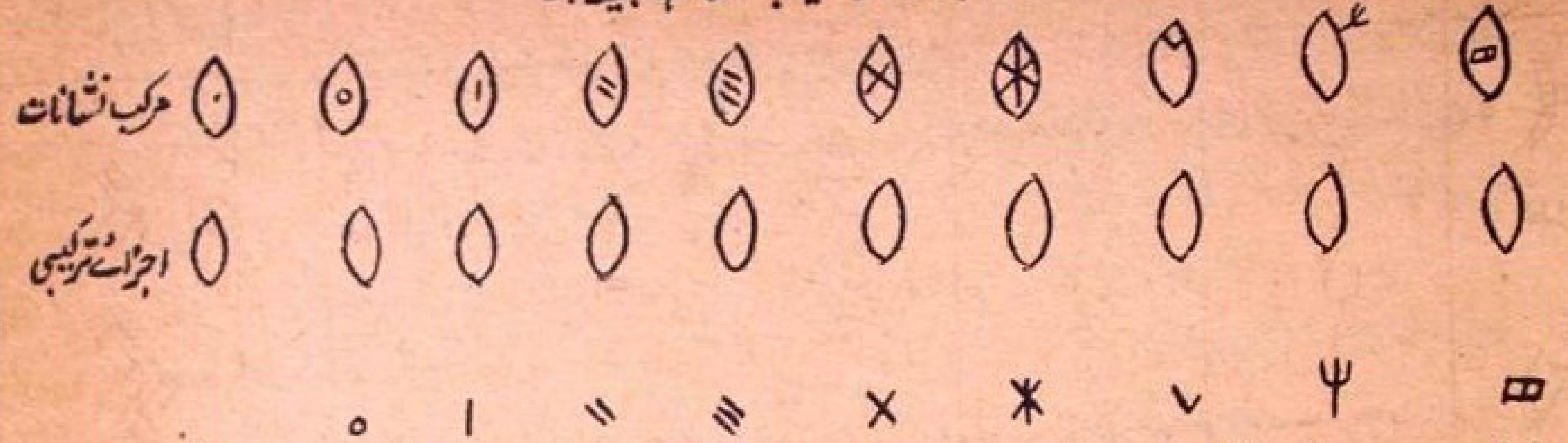

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان مہروں پر ایک سے لیکر بارہ[1] تک جو لکیریں پائی جاتی ہیں اُنھیں گنتی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے یا ارکانِ الفاظ کے طور پر:۔

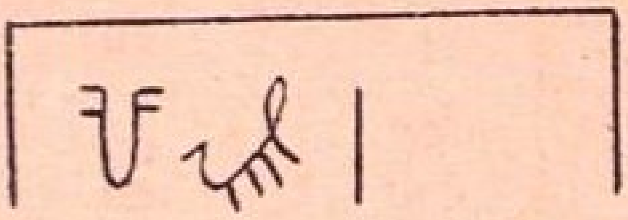

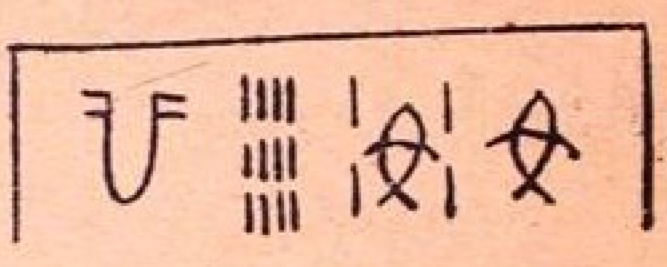

اگر یہ مان لیا جائے کہ مہروں پر پائی جانے والی اس طرح کی علامتیں گنتیاں ہیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ ان مہروں پر بعض چیزوں کا حساب ہے (جیسے اوپر کی مثال میں بارہ گائیں یا مچھلیاں) لیکن جب ہم مہروں کی خوبصورتی کا خیال کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ اُن کے بنانے میں کتنی محنت صرف کی گئی ہوگی تو ہمیں یہ خیال ترک کرنا پڑتا ہے۔ معمولی حساب رکھنے کے لئے اتنی خوبصورت مہریں بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر سمیری رسم خط میں اکثر گنتی کی علامتوں کو "ارکان الفاظ" کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اس لئے ممکن ہے وادیِ سندھ میں بھی ایسا ہی کیا جاتا ہو۔

لکھائی کا رُخ

عام طور سے یہ رسم خط دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا لیکن بعض مہروں پر بائیں سے دائیں کو لکھا ہوا پایا جاتا ہے اور بعض پر دونوں طرف سے۔ یعنی کچھ حصہ دائیں سے بائیں کو اور کچھ بائیں سے دائیں کو۔ اس طرزِ نگارش کو (BOUSTROPHEDON) کہتے ہیں۔ نیچے کی مثالوں کو دیکھئے:۔

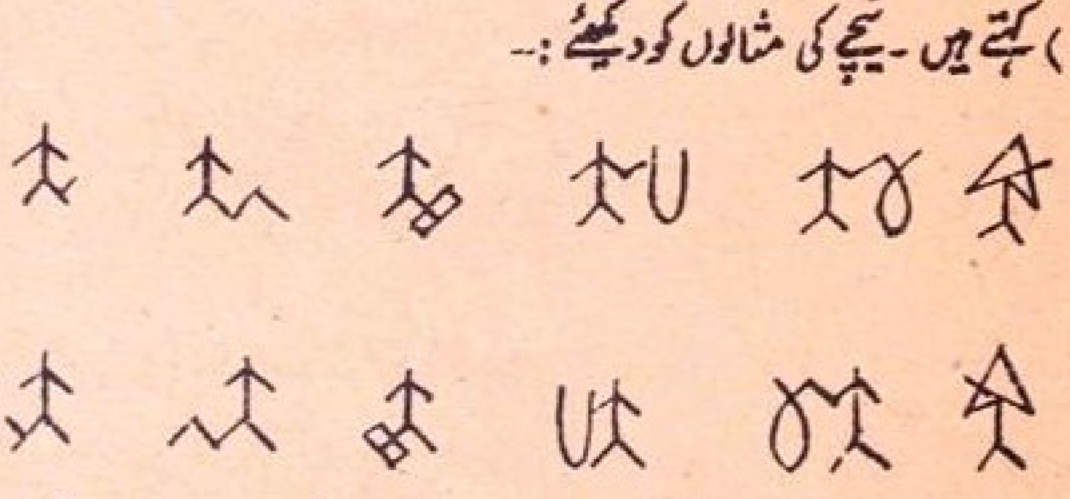

مصری ہیروغلیفی رسم خط میں تصویری نشانات کو اُس طرف سے پڑھا جاتا تھا جس طرف تصویروں کا رخ ہوتا تھا ممکن ہے

---

[1] اسے ایک مثال سے سمجھئے اگر انگریزی لفظ (BEFORE) بمعنی قبل اس طرح (B4) لکھا جائے تو یہاں پر چار کا نشان گنتی نہ ہوگا بلکہ رکنِ لفظ (SYLLABLE)

وادی سندھ کے لوگ اس اصول پر کاربند ہوں ۔ اس صورت میں اوپر والے نشانات کو دائیں سے بائیں کو اور نیچے والوں کو بائیں سے دائیں کو پڑھا جائے گا۔

کتبات کی زبان

اگرچہ کتبات کی لکھائی کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انکی زبان کا سنسکرت سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ وادیِ سندھ کا تمدن آریوں کی آمد سے پہلے کا ہے جب تقریباً پورے شمالی ہند میں دراوڑی قومیں آباد تھیں اس لئے بالکل ممکن ہے کہ وادی سندھ کے لوگ دراوڑی ہوں چنانچہ آج بھی بلوچستان میں دراوڑی لوگوں کی ایک شاخ زمانۂ نامعلوم سے آباد چلی آتی ہے جو "براہوی" زبان بولتی ہے ۔

علاوہ اس کے دراوڑی زبانیں (AGGLUTINATIVE) ہیں اور سمیری لوگوں کی زبان بھی اسی زمرہ میں شامل تھی اس لئے ممکن ہے وادیِ سندھ کی زبان اور عراق کی سمیری زبان میں تعلق رہا ہو۔

دوسری لکھائیوں سے تعلق

وادی سندھ کا رسم خط ایلم (موجودہ خوزستان) کے رسم خط سے مشابہ تھا اور سمیری رسم خط سے نسبتاً کم۔

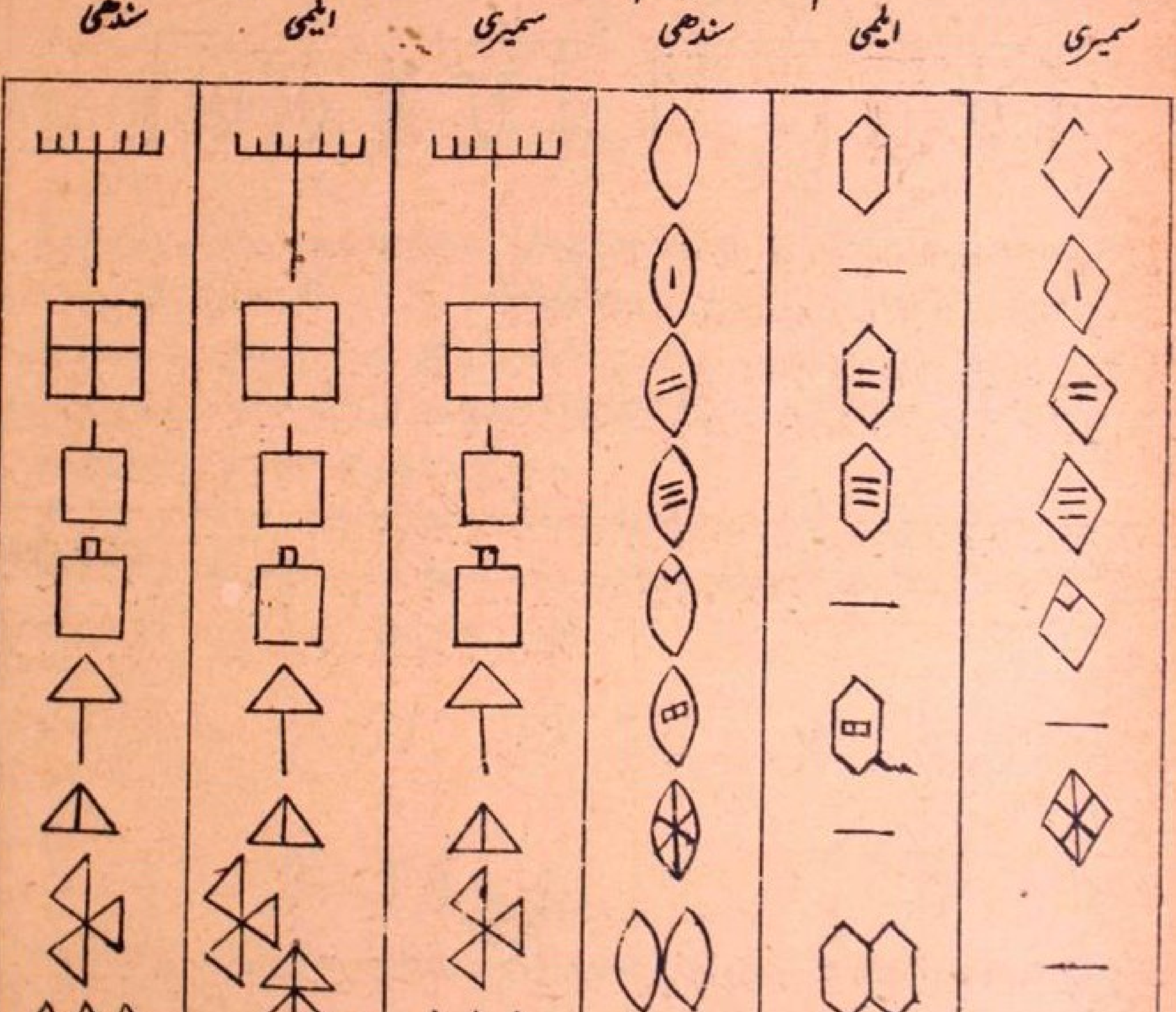

لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس لکھائی کی انسانی تصاویر نہ تو سمیری سے ملتی ہیں اور نہ ایلمی سے ۔ اُن کا بنانے کا انداز مصری ہیروغلیفی سے مشابہ ہے ۔ یہ مشابہت چند اور نشانات میں بھی پائی جاتی ہے :۔

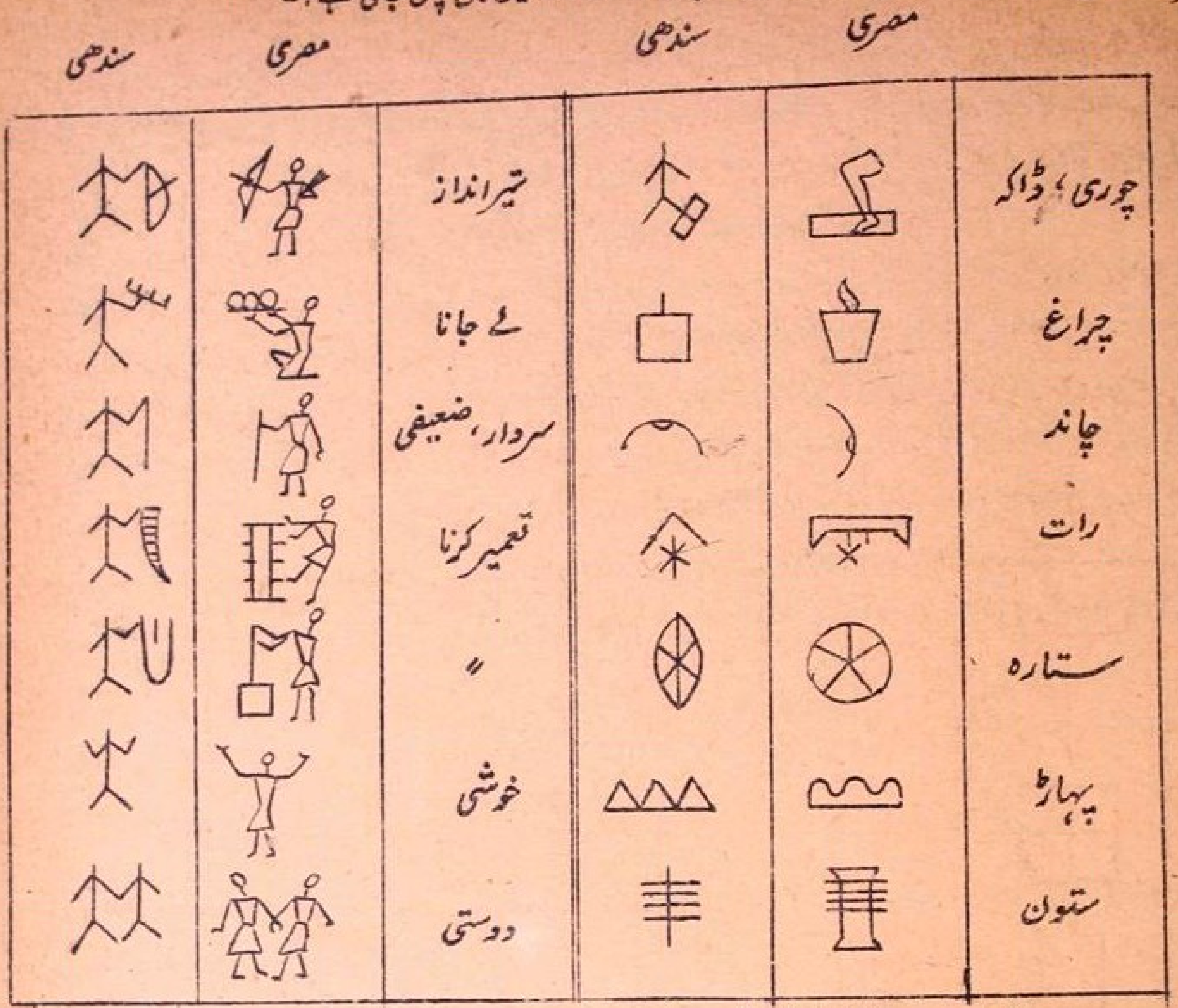
مصری
سندھی
مصری
سندھی
چوری، ڈاکہ
چراغ
چاند
رات
ستارہ
پہاڑ
ستون
تیر انداز
لے جانا
سردار، ضعیفی
تعمیر کرنا
"
خوشی
دوستی

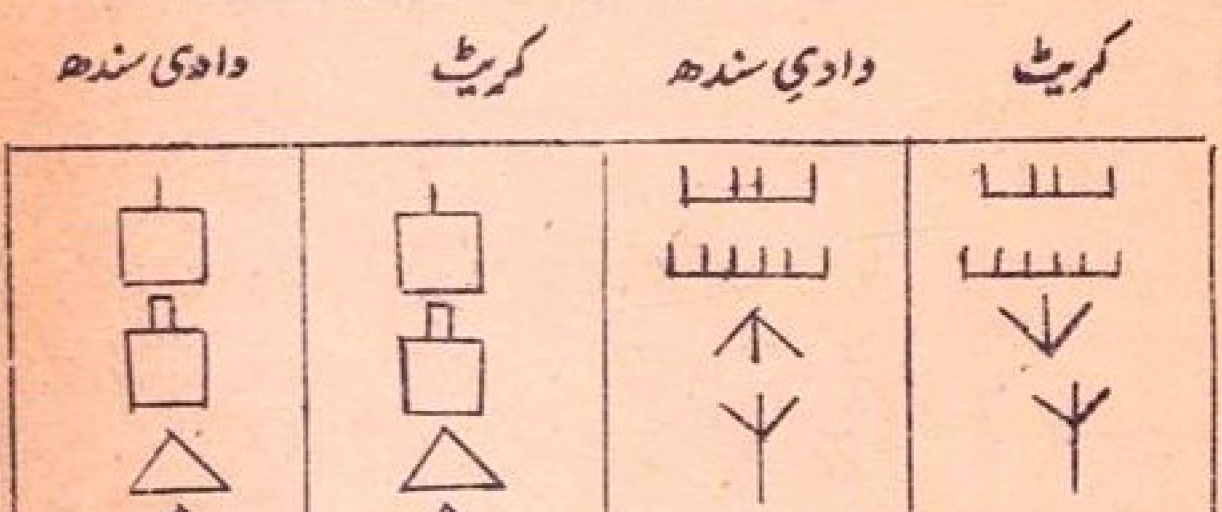
کریٹ
وادیٔ سندھ
کریٹ
وادیٔ سندھ

وادیٔ سندھ کے رسم خط اور کریٹ کی لکھائی ینون) میں بھی کچھ تعلق تھا ۔ چنانچہ دونوں کے عض نشانات تو بالکل ہی ملتے ہیں مثلاً :۔

اسی طرح اُس کا حطی قوم کے رسم خط سے بھی تعلق معلوم ہوتا ہے چنانچہ ہڑپا کی مہروں پر پائے نے والے یہ نشانات 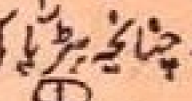 حطی رسم خط ں بھی کام آتے تھے ۔ ان لکھائیوں کے تعلق پر (B. HROZNY) نے بڑی تحقیقات کی ہے کے نظریات کو تسلیم نہیں کیا جاتا ۔

ان لکھائیوں کے باہمی تشابہ کی دو وجہیں ملتی ہیں ایک تو یہ کہ ان میں سے کوئی ایک سب کا

ماخذ بھی، مثلاً سمیری یا ایلمی، یا پھر ان کا ماخذ ماضی بعید کی کوئی ایسی لکھائی تھی جس کا ابھی تک پتہ نہیں چلا ہے۔ ایک وجہ او بھی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ یہ لکھائیاں ہمعصر تھیں اس لئے ایک دوسرے سے متاثر ہوئی تھیں۔

سندھی رسم خط کے ماخذ کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ خود اس سے کون کون سے رسم خط اخذ کئے گئے۔ پروفیسر لینگڈن نے یہ ثا کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہند قدیم کا براہمی رسم الخط وادیٔ سندھ کے رسم خط سے ماخوذ تھا جس کا ذکر ہم براہمی رسم خط کے سلسلہ میں کرینگ

ڈاکٹر ہنٹر نے وادیِ سندھ کے نشانات کا حمیری، سبائی (جنوبی عرب کی لکھائیاں) فنیقی اور قبرصی (جزیرہ قبرص کی لکھائی سے مقابلہ کر کے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کا ماخذ وادیِ سندھ کا رسم خط ہے لیکن یہ نظریہ قابلِ تسلیم نہیں بر ایں بناء کہ سندھ کی لکھا حمیری اور فنیقی وغیرہ رسوم خط کے وجود میں آنے (تقریباً ۱۰۰۰ ق۔م) سے کم از کم ۲ ہزار سال پہلے ناپید ہو گئی تھی۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز اکتشاف (G. DE HEVESY) کا ہے اور وہ یہ کہ جزیرۂ ایسٹر کی لکھائی کے بہت سے نشانا وادیِ سندھ کے نشانات سے مشابہ ہیں۔ جزیرۂ ایسٹر یہاں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر جنوبی امریکہ کے پاس ہے تو کیا اس سے ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وادیِ سندھ کے لوگ تجارت کے سلسلہ میں وہاں تک پہونچ گئے تھے؟ پھر یہ کہ جزیرۂ ایسٹر کا رسم خط اب سے کچھ پہلے تک ر تھا اور عقل یہ باور نہیں کرتی کہ وہ وادیِ سندھ کے تمدن کے زمانہ (۳۰۰۰ ق۔م) سے تعلق رکھتا ہے۔ ممکن ہے یہ مشابہت اتفاقی ہو

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصویری رسم خط کے نشانات آپس میں مشابہ ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی چیز کی تصویر بنائی جائے تصویر بنانے کے انداز میں فرق ہو سکتا ہے مگر تصویروں میں بنیادی طور پر فرق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً برسات کا تخیل مختلف تصویری لکھا میں اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے۔

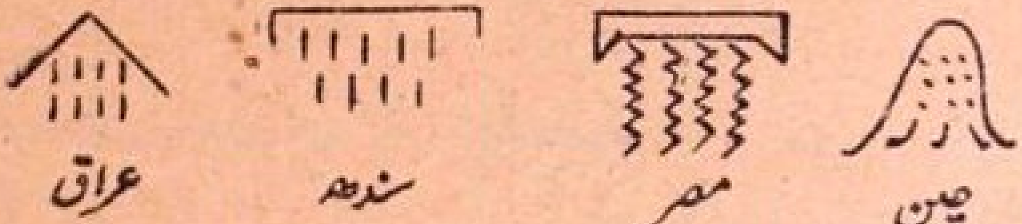

اب اگر ان تصاویر کو ایک دوسرے سے ماخوذ بتایا جائے تو یہ غلطی ہوگی۔ اس لئے وادیِ سندھ کے بہت سے نشانات کی دوسری لکھائی کے نشانات سے مشابہت اتفاقی بھی ہو سکتی ہے۔

پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بعض محققین دو لکھائیوں کے نشانات میں ادنیٰ سی ادنیٰ مشابہت پا کر دونوں کو ایک دوسرے سے متعلق کر دیتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ہنٹر نے وادیِ سندھ کے ان نشانات 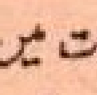 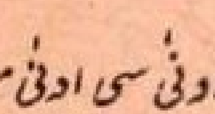 کا مقابلہ مصری ہیروغلیفی کے پھول نشان 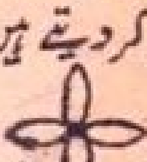 سے کیا ہے، حالانکہ دوسرے نشان کے اوپری حصے سے مراد آسمان ہے جسے ہیروغلیفی رسم خط میں اس طرح 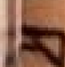 بتاتے تھے اور نیچے کے حصے سے پہاڑ جسے سمیری رسم خط میں اتنی طرح سے بنایا جاتا تھا:-

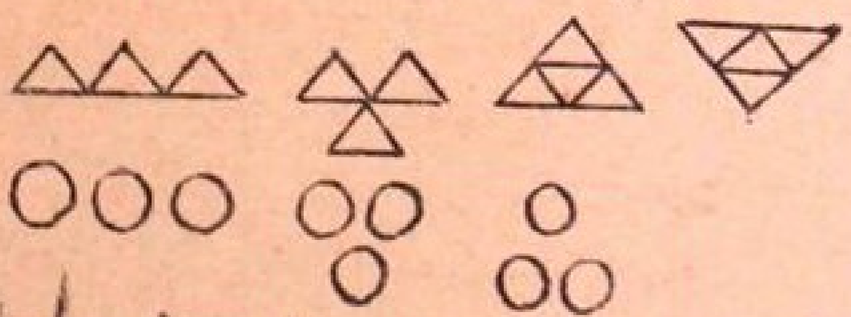

سندھی رسم خط کا نشان اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے (اوپر والی سطر بائیں سے دائیں کو) اس کی تائید ایک دوسرے نشا یعنی 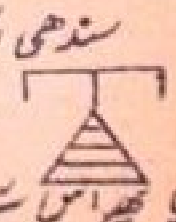 سے ہوتی ہے۔ غالباً اس سے "فلک بوس پہاڑ" مراد ہے لہذا یہ نشان 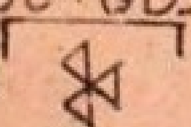 یا تو اسی تخیل کا حامل اور یا پھر اس سے مراد "آسمان کے نیچے کا پہاڑ" ہے۔ اس لئے جس نشان کو ڈاکٹر ہنٹر پھول سمجھتے ہیں وہ اصل میں پہاڑ

کتبات کو پڑھنے کی کوشش — وادیِ سندھ کے رسم خط کو مختلف اوقات میں مختلف حضرات نے پڑھنے کی کوشش کی ہے

سر الگزانڈر کننگھم، مسٹر کے۔ پی۔ جیسوال اور رائے بہادر بشن سروپ نے مہروں کی تصویری لکھائی کے نشانات کو سنسکرت نام ئے اور ان ناموں کی پہلی آواز لے کر کتبات کو پڑھنا چاہا۔ پڑھنے میں براہمی سے بھی مدد لی گئی (براہمی کو سندھی سے ماخوذ مان کر) لیکن جب یہ دیکھتے ہیں کہ وادیِ سندھ کا تمدن "آریوں کی آمد" سے پہلے کا ہے جبکہ ہندوستان میں سنسکرت کا رواج بھی نہ تھا تو ہمیں انکی ش پر حیرت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے بعض ایسے عالم بھی ہیں جنھوں نے وادیِ سندھ کی تہذیب کو ویدی زمانہ کی آریہ تہذیب بت کرنے کی کوشش کی ہے۔

موہنجو داڑو کی دریافت کے بعد ہی پروفیسر لینگڈن اور سی۔ جے گڈ وغیرہ نے یہ بات ظاہر کردی کہ وادی سندھ کے رسم خط نشانات سمیری سے مشابہ ہیں۔ ڈاکٹر ایل۔ اے۔ وڈیل نے مہروں کو سمیری زبان اور رسم خط کی مدد سے پڑھا اور یہ بتایا کہ وادیِ دھ ایک سمیری نوآبادی تھی اور مہروں پر سمیری امرا کے نام پائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کے ڈاکٹر پران ناتھ نے وادیِ سندھ کے رسم خط کو ایک "حروفی لکھائی" ثابت کرنا چاہا۔ اور انھوں نے نی دانست میں اُس کے حروف تہجی کا پتہ بھی لگا لیا جو اُن کے نزدیک براہمی حروف سے مشابہ ہیں (یہ حروف سے مشابہ ہیں یہ حروف سندھی رسم خط کے مرکب نشانات کا تجزیہ کرنے سے حاصل ہوئے تھے) اُنھوں نے کچھ کتبات ان حروف کی مدد سے پڑھے معلوم ہوا کہ اُن پر اُن پر ایسے دیوی دیوتاؤں کے نام نہیں جو سمیری قوم میں پائے جاتے تھے۔ گویا وادیِ سندھ کے لوگ سمیری قوم ہم مذہب تھے لیکن دونوں کی لکھائیوں میں کوئی تعلق نہ تھا؟ — اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ سندھی رسم خط کے بہت سے نشانات مرکب ہیں لیکن ڈاکٹر ناتھ نے بہت سے مفرد نشانات کے بھی ٹکڑے کر ڈالے ہیں۔ اور یہ تو ہم کبھی باور ہی نہیں کر سکتے کہ س وقت جبکہ ایلم، عراق اور مصر میں تصویری رسوم خط مستعمل تھے (جن کے نشانات سے وادیِ سندھ کے نشانات مشابہت کھتے ہیں) وادیِ سندھ میں ایک حروفی رسم خط کا رواج تھا۔

میرے خیال میں وادی سندھ کے رسم خط کو پڑھنے کی سب سے معقول کوشش فادر ہیراس کی ہے۔ اُنھوں نے ادیِ سندھ کے کتبات کی زبان کو دراوڑی مان کر تامل کی مدد سے پڑھا ہے۔ اُن کے بہت سے مضامین اس موضوع پر شایع چکے ہیں۔ — بہرحال ان تمام کوششوں اور کاوشوں کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک یہ بات معلوم کرنے کا کوئی وسرا ذریعہ نہ ہو کہ مہروں پر جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ ہمیں ایسے کتبات کی تلاش ہے جو دو زبانوں میں ہوں (BILINGUAL INSCRIPTI اور اُن میں سے ایک کی لکھائی معلوم ہو (پرانے کتبات کو پڑھنے کا یہی طریقہ ہے کہ نامعلوم کو علوم کی مدد سے پڑھتے ہیں) امید ہے کہ ایسے کتبات کسی نہ کسی دن عراق میں ضرور ملیں گے کیونکہ وادیِ سندھ اور وادیِ دجلہ وفرات ں تجارتی تعلقات تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء میں اُر اور کش (عراق کے مدفون شہر) میں جو کھدائیاں ہوئی تھیں اُن کے دوران میں ض ہندوستانی وضع کی مُہریں ملیں۔ علاوہ ازیں تل اثمر میں مسٹر فرینک فرٹ کو ایک مُہر ملی۔ زمین کے ایک ایسے طبقہ میں جس کا زمانہ ۲۵۰۰ ق م لّم ہے۔ یہ مُہر بیلن نما ہے — وادیِ سندھ میں عموماً چوکور اور چپٹی مہریں مستعمل تھیں۔ لیکن موہنجو داڑو میں تین بیلن نما مُہریں بھی ملی ں اس لئے ممکن ہے کہ ان کا بھی استعمال کیا جاتا ہو۔ اس پر ہندوستانی جانوروں کی تصویریں یعنی ہاتھی، گینڈا، گھڑیال یا مچھلی کھانے لا مگر ہندوستانی طرز میں کندہ ہیں۔ پھر ڈاکٹر ہوٹن کے بیان کے مطابق عراق میں ایک قبل تاریخی زمانہ کا سوتی کپڑا ملا ہے جس پر وادی سندھ مہر کے نشانات ہیں (اس سے مہروں کے استعمال پر روشنی پڑتی ہے) گڈ کا کہنا ہے کہ یہ مہریں موہنجو داڑو اور ہڑپا کے سوا کسی وسرے شہر جیسے چنہو داڑو (موہنجو داڑو کے جنوب میں) بنائی گئی تھیں۔

محمد اسحاق صدیقی

(باقی)

صحرا کا موتی

صبح کے آثار نمودار ہو چلے تھے، یعنی کائنات گریباں کھولکر آہستہ آہستہ اپنا سینہ عُریاں کر رہی تھی۔ دریائے نیل کی موجیں ہلکی ہلکی نسیم کے ساتھ (جسے نسیمِ صباح کہہ سکتے ہیں) مضطرب تھیں، یعنی فطرت چادرِ آب کو جنبش دے دیکر مصروفِ تماشا تھی۔ آسمان کی محراب یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج اس کا خم بہت دور بلندی سے شروع ہوا ہے اور زرّیں ریگستان کے اُفق سے لیکر نیلمی آسمان کے عمق تک، اُن سپید بادلوں کے سوا کوئی چیز حایل نہ تھی، جو سوڈان اور بالائی حصۂ مصر کی فضا میں ہمیشہ اضافۂ حُسن کرتے رہتے ہیں۔ یہ تھی صبح اور ایسی صبح جس کو دیکھ کر ایک شخص بے اختیار کہہ سکتا تھا کہ:-

—— "یہ دُنیا واقعی رہنے کے قابل ہے"۔ —— آفتاب کی گرم و طلائی شعاعیں فضا کو زرکار بنا رہی تھیں اور سطحِ آب کو رنگین۔ مختلف قسم کے طائر سیاہ و سپید، سبز و سُرخ، ارغوانی و قرمزی اپنے بازوؤں کے پورے اضطراب و طپش کے ساتھ ساحل پر آ آکر گر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سبکدست نقاش صفحۂ کاغذ پر جلدی جلدی پھول بناکر چھوڑتا جاتا ہے۔ عین یہی وقت تھا کہ دریا میں ایک کشتی نمودار ہوئی اور موجوں کو قطع کرتی ہوئی ساحل بحر کی طرف بڑھنے لگی۔ ایک سپید طائر نے اپنی گردن اُٹھاکر اک آواز دی اور قدرت کی اس اچھوتی خلوت گاہ میں صنعت انسانی کی مداخلت پر اظہار نفرت کرتا ہوا اُڑ گیا۔ دوسرے طائروں نے بھی یہ آواز سُنی اور کشتی کو دیکھا، لیکن اس سے قبل کہ وہ کوئی فیصلہ رہنے یا اُڑ جانے کا کریں، کشتی ساحل تک آگئی۔ اور ایک سوڈانی لڑکے نے جو اپنے حُسن کے لحاظ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آبنوس میں اڈونس کا مجسمہ طیار کیا ہے اپنے خوبصورت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کشتی نشین سے کہا:-

"وہ ہے اُمدرم"۔

اس کشتی پر ایک نوجوان ترک تھا جو سیاحت کی غرض سے یہ سفر کر رہا تھا، اس کا لباس بالکل مغربی وضع کا تھا اور ریگستان کی دھوپ سے چہرے کو محفوظ رکھنے کے لئے اس قسم کی ٹوپی سر پر رکھے ہوئے تھا جسے ہم انگریزی ٹوپی کہہ سکتے ہیں۔ اُمدرم، ایک ریگستانی گاؤں تھا۔ جس میں سوڈانیوں کی غریب و مفلس آبادی اپنے چھوٹے چھوٹے پست مکانات میں زندگی بسر کرتی تھی، نہ یہاں کوئی کھجور کا درخت تھا نہ چشمہ، نہ کوئی باغ اور تفریح گاہ، لیکن پھر بھی وہ صحرائی دلکشی ریگستان مصر کے ہر ہر ذرہ میں پائی جاتی تھی، اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی، اور اسی کا ذوق سیاحوں کو اس طرف کھینچ لاتا تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں مہدی سوڈانی کا مقبرہ بھی تھا۔

لڑکے نے کہا:- "مجھے اجازت دیجئے کیونکہ مجھے پھر واپس جانا اور دوسرے لوگوں کو لانا ہے"۔

خالد:- "لیکن میرا کیمرہ کیونکر جائے گا اور میں وہاں تک کیسے پہونچ سکوں گا۔ میں تو راستہ سے بالکل ناواقف ہوں

لڑکے نے تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر کچھ سوچا اور پھر بولا "اچھا سامان مجھے دیجئے میں اس کو اپنے گھر کی طر لے چلوں گا۔ اور وہاں پہونچ کر اپنی بہن کو آپ کے ساتھ کر دوں گا"۔

یہ سُن کر سیاح نے کسی قدر تامل کیا۔ گویا اُس نے سوچا کہ کیا وہی کرنا چاہئے جو لڑکا کہتا ہے اور پھر کسی خیال مسرور ہو کر بولا "اچھا مجھے اپنے گھر لے چلو" اور دل میں کہنے لگا اگر وہ بہن اسی بھائی کی ہے تو میری نقاشی و مصوری

ہترین موضوع ہوسکتی ہے۔

(۲)

مرلا اپنے جھونپڑے کے سامنے دروازہ پر کھڑی ہوئی دریا کی طرف دیکھ رہی تھی اور آفتاب کی شعاع سے د براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، تابشِ حُسن کچھ اور نمایاں ہوتی جاتی تھی۔ اس کی عمر سترہ سال کی تھی ور وہ شباب جو اس عمر کی مشرقی لڑکیوں میں اپنے پورے عروج پر پہونچ جاتا ہے اس کے ہر ہر عضو سے ٹپکا ڑتا تھا، اس کا چھریرا اور نازک جسم اس قدر سڈول اور خوبصورت جسم اس قدر سڈول اور خوبصورت تھا کہ اگر وئی بُت ساز چاہتا تو اس سے حُسن تناسب کا استعارہ کرکے کسی مجسمہ میں جان ڈال سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ کشیدہ قامتی صحرائی لڑکیوں کا عام حُسن ہے لیکن مرلا کے جسم میں کچھ اور بھی ایسی بات تھی جس نے اس کو اسی طرح ممتاز کردیا تھا جیسے ہرنوں کے گلہ میں کوئی سب سے زیادہ وحشی ہرنی، یا سانپوں میں ب سے زیادہ نازک و لچیلی ناگن۔ اس کی پیشانی بلند تھی اور ابرو تلوار کی نوک تک پوری طور سے خمیدہ۔ اس کی یاہ آنکھوں میں وہ وحشت تھی جو بڑھ کر سحر ہوسکتی ہے اور ان میں وہ مستی تھی جسے عطرِ شباب سے تعبیر کرسکتے ہیں س کی لانبی لانبی گھنی پلکیں جو پوری طرح جدا ہوجانے کے بعد بھی ایک دوسری سے ملی ہی رہتی تھیں جب بڑی بڑی نکھوں سے اپنے نقاب کو ہٹا لیتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک موج مے تھی جو سر سے گزر گئی، ایک پھانس تھی جو دل میں چُبھ گئی یا ایک سیلاب افسوں تھا جو دیکھنے والے کے ہوش و حواس کو اپنے ساتھ بہا کرلے گیا۔ خوبصورت چمکیلے بال جو بے شمار چھلوں کی صورت میں منتشر تھے، شانہ و دوش پر پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کی گردن وہ حسین گردن د تمام آرائش و زیبائش سے بے نیاز ایک مستقل فوارۂ حُسن تھی اس وقت عریاں تھی اور چھوٹے چھوٹے سفید انت، معلوم ہوتا تھا کہ فطرت نے فرطِ مسرت سے اُس کے منھ میں موتی بھر دئے ہیں۔ غرض یہ کہ مرلا قدرت کی ہترین صناعی اور فطرت کا اختراع فائقہ تھی۔ لیکن باوجود اس کے وہ یہ نہ جانتی تھی کہ حُسن اور حُسن کا مفہوم کیا ہے۔ وہ ایک پھول تھی، وہ پھول جو جنگل کی کسی جھاڑی میں کھلتا ہے، وہ ایک کنول تھی، ایسا کنول جو سطحِ آب ر تنہا ہچکولے کھاتا ہے۔ گاؤں کی اور عورتیں آئینہ دیکھ دیکھ کر سنوارا کرتی تھیں، لیکن وہ کبھی اس طرف متوجہ بھی ہوتی تھی۔ اس کی ہمجولی لڑکیاں بلوری موتیوں کا ہار پہنکر گھنٹوں یہ دیکھتیں کہ وہ ہر سانس کے ساتھ اُن کے سینہ پر س طرح جنبش کھاتا ہے، لیکن مرلا کی حسین گردن، اس مصنوعی آرائش سے مستغنی تھی۔ وہ اس سادگی کے عالم میں ھی اک قیامت تھی عریاں، ایک فتنہ تھی بے نقاب اور ایک نوید عشق تھی، بالکل کھلا ہوا۔

مرلا اپنے حُسن سے بے خبر، مرلا ایک مجسمہ تھی عصمت و عفت کا، حیا و شرافت کا، ایک تمثال تھی خودداری و یرت کی۔ اس میں حُسن تھا لیکن بے پرواہ، اس میں شباب تھا لیکن پُر استغنا۔ وہ غریب تھی لیکن دولتِ حُسن سے لامال، وہ وحشی تھی مگر اس قسم کی جو لاکھوں تہذب و شائستہ دلوں کو تباہ کردے سکتی تھی

اس کا بہترین مشغلہ یہ تھا کہ رات کو اپنے جھونپڑے سے نکلتی اور ایک جگہ بیٹھ کر صحرا کی سنسان تاریکی میں ستاروں کو یکھتی اور اس سے گھبرا جاتی تو اُس دف کی آواز سننے لگتی جو گاؤں میں دور کسی جگہ بجا کرتا تھا۔ جب کبھی مزدوری کرتی تو ب سے پہلے اُجرت میں جو کچھ ملجاتا اس سے گھر کی ضروریات فراہم کرنے میں اپنی ماں کی مدد کرتی اور اس سے بھی بچ ہتا تو پھر اونٹ کا چارہ خریدتی۔ آج بھی وہ اپنے دروازہ پر اسی ضرورت سے کھڑی تھی اور اک خاموش حالتِ مسرت س دریا کی روانی کو دیکھ رہی تھی کہ اس کا بھائی آتا ہوا نظر آیا۔ مسرت اُس کے چہرے پر دوڑ گئی، اس کے رنگ میں خون

کی وہ سُرخی کچھ اور زیادہ نظر آنے لگی جس پر اس کے شباب کی رنگینیاں قایم تھیں ۔ اُس نے بھائی کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھا۔ مگر اسی طرح معصومانہ انداز سے کھڑی رہی ۔ بھائی نے کہا:۔ "مرلا بکس لے جا اور انھیں کریری تک پہونچا دے، مجھے جلدی واپس جانا ہے"۔ مرلا یہ سُن کر جھونپڑے کے اندر گئی اور فوراً واپس آکر ترک نوجوان سے مخاطب ہوکر بولی:۔ "چلئے میری ماں نے اجازت دیدی ہے"۔

اس وقت اُس کی آنکھوں میں اک خاص کیفیت پیدا تھی، چہرے پر ایک رنگ تھا اور رنگ میں تبسم، اس کی آمادگی میں ایک سرور تھا اور سرور میں کچھ بے خبری، اُس نے تصویر کشی کا بکس اُٹھانا چاہا، لیکن خالد نے اُسے خود اُٹھالیا اور مرلا کو صرف تپائی دیدی۔

آفتاب بلند ہوچکا تھا، لوگ کھیتوں کے اندر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور مرلا خاموشی کے ساتھ خالد کے پہلو میں سایہ کی طرح چلی جا رہی تھی ۔ جب گاؤں کی حد سے دونوں دور نکل گئے تو خالد جو ریگستان میں اس طرح پیدل چلنے کا عادی نہ تھا، اپنے اندر اضمحلال محسوس کرنے لگا۔ اُس کا جوتہ ریت میں دھنس دھنس جاتا تھا اس لئے ایک طرف تو اسکے لئے قدم اُٹھانا مشکل ہوگیا اور دوسری طرف دھوپ کی شدت نے اُس کے تمام کپڑے پسینہ میں تر کردئے ۔ مرلا، خالد کی اس تکلیف کو دیکھ رہی تھی لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ تکلیف کیوں ہے وہ تکلیف جس کے اسباب بظاہر موجود تھے، اسکے نزدیک ایسی نہ تھی جس سے ایک شخص مضمحل ہوسکتا، وہ سوچ رہی تھی اور چاہتی تھی کہ اپنی فراست سے تکلیف کی نوعیت معلوم کرلے ۔ اس غرض سے جب اُس نے خالد کی طرف دیکھا تو اس کی نظر خالد کی کلائی پر پڑی جو گرمی کی شدت سے سُرخ ہوگئی ۔ مرلا نے سمجھا کہ شاید خون نکل آیا ہے اور تکلیف و اضمحلال کا سبب یہی ہے۔ اس لئے وہ فوراً اپنے سپید ململ کے نقاب سے ایک دھجی پھاڑ کر کلائی میں باندھ دینے کے لئے آمادہ ہوگئی اور یہ کہتے ہوئے کہ "اسے کلائی میں باندھ لیجئے ورنہ آپ کو اور زیادہ تکلیف ہوگی" خود ہی لپیٹ بھی دی۔

خالد نے کہا "تم نے اپنا نقاب میرے لئے کیوں خراب کردیا؟" مرلا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس حصۂ صحرا کی گزشتہ تاریخ بیان کرنے لگی ۔ خالد سنتا جا رہا تھا، اور خاموش تھا۔ جب کچھ اور آگے بڑھ گیا تو اُسے ایک سفید چٹان ملی۔ اب تو اس کے قدم دفعتہً رُک گئے اور وہ یہ کہکر بیٹھ گیا "مرلا میں بہت تھک گیا ہوں کچھ دیر بیٹھ جاؤ"۔ مرلا نے فوراً تعمیل حکم کی اور اُس کے سامنے خاموش بیٹھ گئی، اُس کے رخسار کا ایک حصہ ہتیلی پر تھا اور ریت پر اپنی نازک اُنگلیوں سے کچھ نشانات بنا رہی تھی۔ پندرہ منٹ اسی حال میں گزر گئے تو خالد بولا "مرلا، تم اجازت دوگی کہ میں تمھاری تصویر کھینچ لوں؟"

مرلا:۔ یہ تو ہمارے دستور و رواج کے خلاف ہے۔

خالد:۔ لیکن کیا میری خاطر سے بھی تمھیں منظور نہیں؟

مرلا:۔ بے شک مجھے آپ کی خاطر اپنے دستور و رواج سے زیادہ عزیز ہے۔

خالد نے تصویر لے لی اور جب اطمینان سے بیٹھا تو کہنے لگا:۔

"مرلا تمھیں معلوم ہے تم کس قدر حسین ہو"

مرلا:۔ حسین! وہ اونٹ جو آپ نے بازار میں بیٹھا ہوا دیکھا تھا اور مہدی کا وہ سپید مقبرہ بے شک حسین ہے۔

خالد:۔ مگر تم اس اونٹ اور مقبرہ دونوں سے زیادہ حسین ہو، اور ہاں میرے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔

مرلا:۔ آپ تو اس آفتاب کی طرح ہیں جو صبح کو اس میدان میں نکلتا ہے یا اس چاند کے مانند جو شام کو نیلگوں آسمان پر نظر آتا ہے۔

یہ کہنے کے بعد مرلا خاموش ہوگئی اور اُس کے کُرتے کے نیچے محسوس ہونے لگا کہ سانس معمول سے زیادہ سریع ہوگئی ہے، اس کی آنکھوں میں کچھ گرمی پیدا ہونے لگی اور آواز میں رعشہ۔ دل میں ایک جوش تھا جس سے وہ شاخ بید کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر خالد بھی خاموش ہوگیا اور اس کے رنگ کی سُرخی سے ظاہر ہونے لگا کہ اب وہ کچھ بولنا نہیں چاہتی۔

(۳)

آج اس گاؤں میں بازار بھی تھا اور اس لئے ایک شور و ہنگامہ جو ایسے اجتماع کی خصوصیت ہے، برپا تھا۔ آدمیوں کا ہجوم تھا اور قرب وجوار کے لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں خریدنے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ اسی میدان کے ایک کونے میں ایک ارغوانی قالین بچھا ہوا تھا، آس پاس اونٹ کھڑے تھے اور قالین پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جو اپنی وضع سے خوشحال سوداگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا لباس بھی اچھا تھا اور اونٹ بھی مضبوط و توانا۔ اس کے سامنے ایک غریب و ناتواں ضعیف آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ سوداگر بولا :-

”یہ صحیح ہے کہ تمھاری مرلا، صحرا کا موتی ہے، لیکن تم یہ خیال کرو کہ ایک نوجوان اونٹ سے تم روزانہ کتنا کما سکتے ہو اور چند دن میں کیسے دولتمند بن جاؤ گے؟“

سننے والے کی سیاہ آنکھیں یہ الفاظ سُن کر چمکنے لگیں، وہ کچھ سوچ کر بولا :-

”یہ تو صحیح ہے۔ لیکن میری لڑکی تو اتنا نہیں کھاتی جتنا یہ اونٹ کھائے گا اور پھر لوگوں کو روزانہ اونٹ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

سوداگر :- ”چونکہ میں تمھیں برہم نہیں کرنا چاہتا اس لئے میں تم کو اونٹ کے ساتھ ایک چاقو بھی دوں گا اور یہ قالین بھی“۔

یہ کہکر سوداگر نے چاقو اپنی کمر سے نکالا اور ضعیف سوڈانی کے سامنے رکھدیا اس نے چاقو کو دیکھا اور کہا :-

”اگرچہ یہ چاقو معمولی ہے لیکن خیر میں معاملہ کرلوں گا۔ جب آپ واپس جائیں گے تو لڑکی آپ کے گھر پہونچا دیجائے گی“۔

سوداگر :- ”میں ابھی گھر تو واپس نہ جاؤں گا کیونکہ مجھے اور سفر کرنا ہے لیکن جس دن چاند پورا ہوگا اس دن پھر یہاں آؤں گا اور مرلا کو ساتھ لے جاؤں گا۔ دیکھو کرنو اب مجھے مایوس نہ کرنا“ کرنو نے کہا۔ ”نہیں اب ایسا نہیں ہوسکتا“۔ اس نے اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لی، چاقو کمر میں رکھا اور قالین بغل میں دباکر گھر روانہ ہوگیا۔

آسمان کا رنگ قرمزی ہوچلا تھا اور دریائے نیل کی لہریں طلائی سے ارغوانی، کہ صحرا کی طرف سے خالد اور مرلا ساحل پر پھر واپس آئے تاکہ ایک دوسرے سے جدا ہوں۔

خالد :- مرلا اب تم مجھے اجازت دو۔ میں اپنا سفر پھر شروع کروں گا۔

مرلا نے اپنی مسترحم نگاہیں اُٹھائیں اور کہا ”آفتاب سیاہ چٹانوں کو روز روشن کردیتا ہے لیکن پھر غروب ہوکر ان کا سارا رنگ، ساری مسرت چھین لیتا ہے پھر کیا اس وقت کوئی پتھر یہ توقع کرسکتا ہے کہ وہ سورج کو غروب ہونے سے روک لیگا اور اپنی روشنی کو باقی رکھ سکے گا؟ آپ جائیے“۔

خالد :- لیکن اگر میں نہ جاؤں اور چاہوں کہ کوئی ایک چاندنی رات اس وسیع خلوت میں بسر کروں اس طرح کہ میں ہوں اور تم، تو تم سمجھتی ہو کہ میں پھر بھی زندہ رہ سکوں گا؟

مرلا :- میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کیا کہتے ہیں۔ آپ زندہ نہ رہیں گے کیوں؟

خالد :- اگر کسی پھول کو یہ خبر ہو کہ اس کی نکہت ایک دماغ کو معطر کرسکتی ہے، اس کی نزاکت کے تخیل سے ایک قلب

پاش پاش ہو سکتا ہے، اس کے رنگ میں وہ اثراتِ حُسن پنہاں ہیں، جن سے بہار کی ساری دلربائیاں قایم ہیں تو میں تم کو بھی بتا دوں کہ تمھاری اِک نگاہ، ایک مستغنی نظر، میرے ساتھ وہ کچھ کر سکتی ہے جو تیر و خنجر سین کے ساتھ کرتے ہیں میرے بدن میں لرزہ ہے، میری روح میں ارتعاش - میرے جسم میں کپکپی ہے، میرے اعضا میں تھرتھراہٹ - لیکن تمھیں کیا خبر کہ یہ سب کیوں ہے اور کس لئے"

مرلا :- لیکن اگر میری نگاہوں سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو میں ان کو ہٹا لوں گی میں آپ کے پاس تنہائی میں کوئی چاندنی رات نہ بسر کروں گی - اس دریا کے کنارے جب شام ہو جائے گی، میں کبھی آپ کے پاس نہ بیٹھی رہونگ جب آپ کی روح میں لرزش محسوس ہونے لگے گی، جب میں دیکھوں گی کہ ساحل پر اب کوئی نہیں رہا اور سارے کشتی بان اپنے اپنے گھر چلے گئے تو میں خود بھی چلی جاؤں گی -

(۴)

راستہ پرسکون تھا - چاند پورا چاند افق سے نکل چکا تھا، خالد، مرلا کے ساتھ دریائے نیل کی سیر کر رہا تھا اور سوچتا جاتا تھا کہ اس کی زندگی جو اب سے پہلے بالکل آزاد و خود مختار تھی آج پابند و گرفتار ہے اور دُنیا کے تمام تعلقات سے گھری ہوئی - وہ اپنے دل سے کہہ رہا تھا - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرلا انسان ہے یا دیوی، اور میں اس کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں - مرلا بھی خاموش تھی شاید اس کے دل میں بھی ایسے ہی خیالات کا مدوج ہو رہا تھا - دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور پھر حجاب و انفعال کی پوری حیرت سامانیوں کے ساتھ اپنی نگاہیں نیچی کر لیتے - فطرت کا یہ دلفریب منظر، ساحل کی یہ اچھوتی فضا، گویا ان دونوں کی جولان گاہ خیال تھ جس میں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ تخیل کی اُلجھنوں میں مبتلا تھے - وہ اس آغاز کو دیکھ کر انجام پر کوئی حکم لگانا چاہتے تھے وہ اِس ابتدا کے سہارے سے انتہا کا کوئی راز دریافت کر لینے میں مصروف تھے - لیکن باوجود اس کے اُن کا ہر خیال تصادمِ نظر کے بعد روح میں بالیدگی پیدا کرنے کے بجائے اضمحلال پیدا کر دیتا تھا - ان میں سے ہر ایک اپنے وارد دل بیان کرنے سے عاجز تھا - البتہ آنسوؤں سے نکل پڑنے والا الم کبھی کبھی ان کی ساری کیفیت ظاہر کر دیتا ت وہ کبھی مسکرا بھی دیتے، لیکن یہ مسکرانا بھی تردد سے خالی نہ ہوتا تھا - جب بہت دیر اسی حال میں گزر گئی تو مرلا نے کہا "آج تو آپ بہت افسردہ و مضمحل نظر آتے ہیں"

خالد :- ہاں، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میری محبّت مجھے کہاں لئے جا رہی ہے -

مرلا :- آپ اس کی فکر ناحق کرتے ہیں قسمت پر چھوڑ دیجئے وہ مستقبل کے ہر لمحہ کی نسبت اپنا فیصلہ مستحکم رکھتی

خالد :- مگر قسمت پر چھوڑ دینا بھی تو آسان نہیں -

مرلا :- تو زیادہ آسان یہ ہے کہ آپ واپسی کا عزم کر لیجئے وطن پہونچ کر یہ خیالات رفع ہو سکیں گے -

خالد :- اور تم ؟

مرلا :- مجھے یہیں کہیں دفن ہو جانے دیجئے -

خالد :- آخر تمھیں میرے ساتھ چلنے میں کیا عذر ہے -

مرلا :- یہ ناممکن ہے، وہ ذرے جو رات بھر چاند کی ضیاء میں جگمگایا کرتے ہیں صبح کو اس کا ساتھ نہیں دے سک

خالد :- تو میں چلا جاؤں، اس پر تم راضی ہو ؟

مرلا :- ہاں، راضی ہوں - اس لئے کہ آپ کے چلے جانے کے بعد موت مجھے کچھ کم سکون نہ پہونچائے گی، خاص

ں حالت میں کہ آپ کی محبت میری روح سے جدا نہیں ہوسکتی۔

رات کا حصہ زیادہ گزر گیا تھا اور خالد کو دریا عبور کرکے خرطوم اپنے جائے قیام پر پہونچنا تھا، اس لئے وہ ر ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔ مرلا کچھ دیر تک کھڑی رہی اور جب خالد نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اُس نے ن اپنے گھر جانے کا قصد کیا۔ وہ جانے ہی والی تھی کہ اُس نے دیکھا کہ خالد اپنا کوٹ بھول گیا ہے۔ اس نے چاہا دوڑ کر دیدے لیکن پھر یہ خیال کرکے کہ کل دیدوں گی اپنے بازو پر ڈال لیا۔ اب رات زیادہ جا چکی تھی۔ اسلئے جلدی جلدی گھر کی طرف آئی۔ اس کا جھونپڑا روشن تھا اور اندر سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔

تم مجھ سے ایک اونٹ، چاقو اور قالین لے چکے ہو، لیکن اب تک مرلا کو تم نے میرے پاس نہیں بھیجا۔ اور ہجتے کیسے۔ شاید تم کو خود خبر نہیں کہ مرلا کہاں ہے۔ وہ ایک اجنبی کے ساتھ نیل کے کنارے باتوں میں مصروف ہ اور اب مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ تم تو میرا چاقو اور قالین میرے حوالے کرو، اونٹ میں خود کھول لوں گا۔

کرنو نے یہ سنتے ہی ایک چیخ ماری اور چاقو نکال کر فوراً ایک پتھر پر تیز کرنے لگا۔

مرلا کا خون خشک ہوگیا۔ اس کے قلب کی حرکت بند ہونے لگی اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدنام اور رسوا ہوئی ، اس لئے کہ خالد اگر راستہ میں مل گیا تو وہ ضرور ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس لئے وہ فوراً جھونپڑے کے دوسرے حصہ ں گئی جہاں اُس کا بھائی سو رہا تھا اور اُسے جگا کر بولی "تو ابھی دریا کی طرف جا راستہ میں تجھے ایک اجنبی ح ملے گا اس سے کہدینا کہ اب اِدھر وہ کبھی نہ آئے کیونکہ لوگ اُسے ہلاک کردینا چاہتے ہیں"

بھائی کو روانہ کرکے وہ دروازے سے باہر نکلی ہی تھی کہ اس کا باپ بھی دوسرے دروازے سے نکلا اور ھیرے میں دیکھنے لگا کہ اُسے کس طرف جانا چاہئے۔ مرلا نے سمجھا کہ غالباً خالد کو اطلاع ہونے سے قبل اس کا باپ حل تک پہونچ جائے گا۔ اس لئے اُسی لمحہ میں کچھ سوچکر اس نے خالد کے کوٹ کو اپنے جسم پر ڈال لیا اور قصداً نپڑے کی پشت سے جاکر ادھر کھڑی ہوگئی جدھر سے اس کا باپ گزرتا۔ وہ ابھی وہاں پہونچی ہی تھی کہ اس کا ، ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو لئے ہوئے اس طرف سے گزرا اور یہ اس کو دیکھ کر اس طرح بھاگی کہ اُسے یقین ہوجائے جنبی یہی ہے، جس کی اُسے تلاش ہے۔ چنانچہ کرنو نے کوٹ کو دیکھ کر یہی یقین کیا اور اُس کے پیچھے دوڑا۔ مرلا ھی ایک ناکمل سعی اپنی جان بچانے میں کی۔ کبھی اِدھر بھاگی، کبھی اُدھر مڑگئی، لیکن آخر کو کرنو نے اُسے ۔ اور عین اُس وقت جبکہ وہ آگے کو بھاگ رہی تھی اس نے چاقو کی ایک ایسی ضرب پہونچائی کہ دستہ تک شانہ نیچے تیر گیا اور مرلا ایک کراہ کے ساتھ مُنھ کے بل گر پڑی۔

کرنو اب مطمئن تھا۔ اس لئے کہ اُس کا انتقام پورا ہوچکا تھا اور اسی لئے اُس نے اس سے قبل کہ اجنبی کی ورت دیکھنے کی کوشش کرے اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا تاکہ تنفس ٹھیک ہوجائے۔ مگر جب اس نے چاقو نکالنے کے لئے لاش کو اپنی طرف کھینچا اور اُس کا چہرہ چاندنی میں دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ تو را کا موتی ہے"

"ق"

تذکرہ معرکۂ سخن

وعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں تمام ان اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو شعراء فارسی و اردو کے کلام پر کئے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ اعتراضات ابات بھی دئے گئے ہیں اور ان پر محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ جن شعراء کا اس میں ذکر کیا گیا ہے ان کے حالات بھی دیدئے گئے ہیں، وہ حضرات جو فن شعر کے نکات و رموز اقف ہونا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب بڑا بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ صرف چند جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت مع محصول چار روپیہ آٹھ آنے۔

منیجر نگار لکھنؤ

موجودہ ہندی اور اُس کی نئی اصطلاحات

مجھے چونکہ زبانوں کے پیدا ہونے اور اُن کی ترقی یا زوال کے اسباب معلوم کرنے سے دلچسپی ہے، اس لئے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندی کے بہی خواہ جو اس زبان کو ہر قیمت پر جلد از جلد رائج کرنا چاہتے ہیں، سخت غلطی پر ہیں، اور لسانیات کے علم سے قطعًا بے بہرہ ہیں، احکام یا جذبات کے اثر سے زبانیں پیدا نہیں ہوتیں تاریخ کی تدریجی رفتار زبانیں بناتی اور مٹاتی ہے۔

ہندی زبان میں علمی اصطلاحات تو درکنار متمدن زندگی کی معمولی چیزوں کے نام تک نہیں ہیں، ہندی ڈکشنری پوری پڑھ ڈالئے مشکل سے آپ کو چند نام کھانے پینے کی چیزوں کے۔ لباس کے یا مکان وغیرہ کے حصوں کے، نظر آئیں گے، اس قسم کے جو الفاظ بھی ہیں وہ یا تو اردو، فارسی یا انگریزی سے لئے گئے ہیں، لہٰذا ایسی محدود زبان کے متعلق یہ کوشش نہیں کرنی چاہئے کہ مشکل اصطلاحیں بنا بنا کر اُس کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیدیا جائے ایک بڑی غلطی یہ کی جارہی ہے کہ انگریزی اور اُردو کے آسان الفاظ اور اصطلاحات کو خارج کرکے ان کی جگہ مشکل الفاظ گھڑے جارہے ہیں، یہاں تک کہ ریل، انجن، سائکل، گواہ، عدالت جیسے عام فہم الفاظ کا بھی ترجمہ کردیا گیا ہے۔

اس قسم کی کوشش ہندی کو فایدہ پہونچانے کے بجائے نقصان پہونچا رہی ہے، ایک طرف تو ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قومی زبان ہندوستان بھر کی عام زبان بن جائے اور دوسری طرف سنسکرت کے مشکل اور مردہ الفاظ کو زبان میں شامل کرکے اُس کو مشکل سے مشکل تر بنانے میں لگے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہند میں روز بروز ہندی کی مخالفت بڑھ رہی ہے۔

ذیل میں آج کل کی اصطلاحی ہندی میں ایک فرضی سفر کے حالات درج کرتا ہوں، اور آپ ہی سے جو اس ملک کے باشندے ہیں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اس مضمون کو اور اس کے الفاظ کو کہاں تک سمجھ سکے۔ اس کے تمام تر اصطلاحی الفاظ آئین ہند کے ہندی ترجمہ سے، اور ناگپور کی مطبوعہ ”پرشاسن شبد کوش“ مولفہ ڈاکٹر رگھو ویر پی، ایچ ڈی، ڈی لٹ، و جی ایس گپتا اسپیکر لیجسلیٹو اسمبلی مدھیہ پردیش اور دوسری جدید اور مستند ڈکشنریوں سے لئے گئے ہیں۔

محمود علی خاں

ایک فرضی سفرنامہ

آج ۱۴؍ اگست ہے کل بھارت کے سوتنتر[1] (स्वतंत्र) ہونے کا شبھ[2] دِوس[3] (शुभ दिवस) ہے۔ آج پرتییک[4] بھارتی[5] (प्रतियेक भारतीय) کا ہردے[6] (हृदय) ہرشت[7] (हर्षित)	آج ۱۴؍ اگست ہے، کل بھارت کے آزا[1] ہونے کا مبارک[2] دن[3] ہے، آج ہر ایک[4] ہندو[5] کا دل[6] خوش[7] ہے۔

اتہ (अत:) کیسے سمبھو (संभव) ہے کہ میں اپنے گھر میں چاپ بیٹھا رہوں، میں بھی تو اپنے راشٹر (राष्ट्र) کا شبھ چنتک ج بھکت (शुभ चिंतक तथा राज भक्त) ہوں میرے ہردے یسا وچار (विचार) آتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہوا، میں نے اپنے سمست (समस्त) اوشیک کاریوں (आवश्यक कार्यों) کو چھوڑ دیا گھر سے باہر نکلا۔

پہلے میں دوی چکر (द्विचक्र) پر، اُس کے پشچات (पश्चात) دوی چکر (वहित्र द्विचक्र) پر اور انت (अंत) میں ر رتھ (वहित्र रथ) پر چڑھ کر سمیان استھان (संयान स्थान) پہنچا، اور میں نے سوچا کہ میں سوادھینتا (स्वधीनता) کے بھویہ (भव्य) روہ (समारोह) میں دلّی پہونچ کر بھاگ (भाग) لوں، (यत:) مجھے کچھ وستوئیں (वस्तुएँ) پوٹلی (पोटली) بمبئی بھیجنا تھیں اس لئے میں سمیان پوٹلی کاریالیہ (संयान पोटली कार्याल) میں گیا اور پوٹلی لپک (पोटली लिपिक) سے ان وستو بھاٹک (संयान वस्तु भाटक) کے ندھ (संबन्ध) میں وگیپتی (विज्ञप्ति) پراپت (प्राप्त) کی اور پوٹلیاں بھیج کر دور لیکھ کاریالیہ (दूरलेख - कार्याल) میں گیا اور اپنے دلّی پہونچنے کی سوچنا (सूचना) ایک متر (मित्र) کو دور لیکھ (दूरलेख) دوارا (द्वारा) دی۔

اس بیچ میں جب میری درشٹی (दृष्टि) شیام پٹ (श्याम-प-) پر پڑی تو گیات (ज्ञात) ہوا کہ سمیان کے آنے میں ابھی ایک کا ولمب (विलम्ब) ہے، اس لئے میں سمیان کی پرتیکشا (प्रतीक्षा) تھم شرینڑی سمّلت وشرام گرہ (प्रथम श्रेणी सम्मलित विश्राम गृह) میں جا بیٹھا اور میں نے سمیان کے ایک کرمچاری (कर्मचारी) سے ولمب کا کارن (कारण) پوچھا، وہ ی پوچھ تاچھ کاریالیہ (पूछ ताछ कार्यालय) کا یان لپک (प्रधान लिपिक) تھا اُس نے بتایا کہ راستے میں سمیان کے (यन्त्र) بگڑ گیا ہے اور اُس کے باشپ پتر (बाष्पित्र) کے جانے کا ڈر ہے، پرنتو (परन्तु) وہ سوچنا ٹھیک نہیں، اور گنتر بھک کرتا ہوا سمیان کو لئے ہوئے آپہونچا، میں نے دوتیہ شرینڑی

اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے گھر میں چپ چاپ بیٹھا رہوں، میں بھی تو اپنی قوم کا خیر اندیش اور وفادار ہوں میرے دل میں ایسا خیال آتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہوا، میں نے اپنے سب ضروری، کاموں کو چھوڑ اور گھر سے باہر نکلا۔

پہلے میں سائکل پر، اُس کے بعد موٹر سائکل پر اور آخر میں موٹر پر سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن پہونچا اور میں نے سوچا کہ میں آزادی کے شاندار جشن میں دہلی پہونچ کر حصہ لوں، چونکہ مجھے کچھ چیزیں پارسل بنا کر بمبئی بھیجنا تھیں اس لئے میں ریلوے پارسل کے دفتر میں گیا اور پارسل کلرک سے اور ریلوے پارسل کے محصول کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اور پارسل بھیج کر تار گھر میں گیا اور اپنے دہلی پہونچنے کی اطلاع اپنے ایک دوست کو تار کے ذریعہ بھیجدی۔

اس درمیان میں جب میری نظر بلیک بورڈ پر پڑی، تو معلوم ہوا کہ ریل کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ کی دیر ہے اس لئے میں ریل کے انتظار میں، فرسٹ کلاس جنرل ویٹنگ روم میں جا بیٹھا اور میں نے ریلوے کے ایک اہلکار سے (گاڑی کے) لیٹ ہونے کا سبب پوچھا وہ اہلکار انکوائری آفس کا ہیڈ کلرک تھا، اُسنے بتایا کہ راستہ میں ریل کا انجن بگڑ گیا ہے اور بوائلر کے پھٹ جانے کا ڈر ہے لیکن وہ اطلاع ٹھیک نہیں نکلی اور انجن بھک بھک کرتا ہوا ریل کو لئے ہوئے آپہونچا میں نے سکنڈ کلاس

(द्वितीय श्रेणी) کا سمیان پترک (सम्मान पत्रक) لے رکھا تھا، جھٹ سے میں اپنی شرینڑی (श्रेणी) میں جا بیٹھا اور سمیان بھی چل پڑا۔

میں شاکاہاری (शाका हारी) نہیں ہوں اس لئے مجھے بھوجن (भोजन) کے سمبندھ میں بڑا کشٹ (कष्ट) اٹھانا پڑا اور رات کا سمے تھا اور سمیان کی ودیت پرکاش (विद्युत प्रकाश) بھی مندا تھا اس لئے کوئی پستکا اتھوا سماچار پتر (पुस्तका अथवा समाचार पत्र) بھی نہ پڑھ سکا۔

پراتہ کال (प्रातः काल) ہمارا سمیان دلی پہونچ گیا، منچ (मंच) پر بڑی بھیڑ تھی، بہت سے آرکشی (आरक्षी) بھی وہاں سموش (समवेश) لگائے دکھائی دئے۔ سمیان استھان سے باہر نکل کر میں نے کسی آواس گرہ (आवास गृह) میں ٹھہرنے کا وچار کیا، نئی دلی میں بھارت آواس گرہ بہت پرسدھ (प्रसिद्ध) ہے۔ جب میں نے دور بھاش (दूरभाष) دوارا آواس گرہ کے ویوستھاپک (व्यवस्थापक) سے گیات کر لیا کہ وہاں میرے ٹھہرنے کے لئے استھان ہے تو میں ترنت (तुरन्त) ہی ایک وہستر رتھ بھاٹک (भाटक) پر لے کر وہاں پہونچ گیا۔ اور آواس گرہ کی ایک کوٹھری دس روپیہ دینک بھاٹک (दैनिक भाटक) پر لی سمیان میں میری مسی پورن لیکھنی (मसी पूर्ण लेखनी) کھو گئی تھی اس لئے میں نے کاری چلانے کے لئے ایک لیکھنی (लेखनी) ایک انکنی (अंकनी) ایک مسی پاتر (मसी पान) اور کچھ مسی (मसी) مول لے کر اپنے پاس رکھ لی۔

میرے متر جن کو میں نے دور لیکھ بھیجا تھا وہ مجھ سے ملنے سمیان استھان پر نہ آسکے، ان سے بھینٹ ہونے پر گیات ہوا کہ دور لیکھ ان کو میرے دلی پہونچنے کے دوسرے دن ملا تھا۔

یاترا (यात्रा) کی تھکان سے میرے شیرش (शीर्ष) میں پیڑا (पीडा) ہو رہی تھی اس لئے میں شیا (शय्या) پر وشرام (विश्राम) کرنے کے لئے لیٹ گیا، پھر میں چائے پی کر آواس گرہ سے نکلا اور وہستر رتھ پر چڑھ کر ٹھیک آٹھ بجے لال قلعہ کے سامنے والی چورس بھومی (चौरस भूमि) پر پہونچ گیا، وہاں پرایہ (प्रायः) ایک لاکھ منشیوں (मनुष्यो) کی بھیڑ ہوگی، جس میں پرتیک ورگ (वर्ग) اور جاتی (जाति) کے ویکتی (व्यक्ति) دکھائی دے رہے تھے اور ایک وشیش (विशेष) استھان پر گنیہ (गण्य) منتری اور نیتا کھڑے ہوئے تھے۔ راشٹرپتی (राष्ट्रपति) سیناپتی (सेनापति) (

کا ٹکٹ لے رکھا تھا، جھٹ پٹ میں اپنے درجہ میں جا بیٹھا، اور ریل بھی چل پڑی۔

میں ویجیٹیرین نہیں ہوں، اس لئے مجھے کھانے کے بارہ میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑی، اور رات کا وقت تھا او ریل کی بجلی کی روشنی بھی مندی تھی، اس کوئی کتاب یا اخبار بھی نہ پڑھ سکا۔

صبح سویرے ہماری ریل دہلی پہونچ گئی، پلیٹ فا پر بڑی بھیڑ تھی، بہت سے پولیس کے کانسٹ بھی وہاں وردیاں لگائے دکھائی دئے۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے کسی ہوٹل می ٹھہرنے کا خیال کیا، نئی دہلی میں بھارت ہو بہت مشہور ہے، جب میں نے ٹیلیفون کے ذ ہوٹل کے منیجر سے معلوم کر لیا کہ میرے ٹھہرنے کے ل وہاں جگہ ہے تو میں فوراً ایک موٹر کرایہ پر لی وہاں پہونچ گیا اور ہوٹل کا ایک کمرہ میں نے دس روپیہ روزانہ کرایہ پر لیا، ریل میں می ٹی ڈ مین پن کھو گیا تھا، اس لئے میں نے کام چلانے کے لئے ایک قلم، ایک پنسل، ایک دوا اور کچھ سیاہی مول لیکر اپنے پاس رکھ لی۔

میرے دوست جن کو میں نے تار بھیجا تھا وہ مجھ سے ملنے اسٹیشن پر نہ آسکے، ان سے ملاقات ہونے معلوم ہوا کہ تار انکو میرے دلی پہونچنے کے دوسرے د ملا تھا۔ سفر کی تکان سے میرے سر میں درد ہو تھا اس لئے میں پلنگ پر آرام کرنے کے لئے لیٹ گ پھر میں چائے پی کر ہوٹل سے نکلا اور موٹر پر سوار ٹھیک آٹھ بجے لال قلعہ والے میدان پر پہونچ گیا تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کی بھیڑ ہوگی جس میں ہر طبقہ اور فرقہ کے اشخاص دکھائی دے رہے تھے ایک خاص جگہ پر معزز وزیر اور لیڈر کھڑے ہوئے تھے

نادھی پتی (नावधिपति) اور وایودھی پتی (वायुधिपति) بھی اُپستھت (उपस्थित) تھے اور سب دھوجا روہن (ध्वजा-रोहण) کی پرتیکشا کر رہے تھے، اتنے میں پردھان منتری (प्रधान मंत्री) آگے بڑھے اور انھوں نے اس سنسکار (संस्कार) کو بڑی مہیما (महिमा) سے پورا کیا، اُس سمے پر ہر ایک ویکتی کا ہردے راشٹریہ گرو (राष्ट्रीयगर्व) سے بھرا ہوا تھا، اس سنسکار کے سماپت (समाप्त) ہونے پر سب وہاں سے لوٹ کر اپنے اپنے گھروں کو چلدئے اور میں بھی دلّی نگر میں گھومنے پھرنے لگا، میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹا بڑا مارگ (मार्ग) راشٹریہ جھنڈوں سے سجا ہوا تھا۔

دوسرے دن میں نے سوچا کہ دلی ایک ایتہاسک (ऐतिहासिक) نگر ہے، یہاں کے پُراتتو (पुरातत्व) کو دیکھے بنا نہیں جانا چاہئے، میں دن بھر ایتہاسک اسمارکوں (ऐतिहासिक स्मारकों) کو دیکھتا رہا، میرے تیسرے دن کا کاری کرم (कार्य क्रम) یہ تھا کہ سرکاری کاریالیوں (कार्यालयों) اور سچی والیہ (सचिवालय) کو دیکھوں، پہلے میں پرسارن گرہ (प्रसारणगृह) دیکھنے گیا، وہاں بھن بھن (भिन्न भिन्न) بھاشا بھاشکوں (भाषा भाषकों) سے میری بھینٹ ہوئی، جو ودیشی (विदेशी) بھاشاؤں میں اپنے اپنے کاری کرم پرسارت (प्रसारित) کرتے ہیں، میں نے آکاشوانی (आकाश वाणी) کے ہر وبھاگ (विभाग) کو دیکھا، مجھے کر نردھارن ادھی کاری (कर निर्धारण अधिकारी) سے ملنا تھا، اُن سے ملنے کے پشچات، ویاپار، شکشا، نرمان، وکاس، پرراشٹر، گرہ، وت، شرم، رکشا، کھادیہ اور یاتایات

शिक्षा, व्यापार
रक्षा श्रम, वित्त, गृह, परराष्ट्र, विकास, निर्माण
यातायात खाद्य

منتریوں کے کاریالیہ دیکھے، منتریوں کے سچو (सचिव) بھی اِدھر اُدھر پھرتے دکھائی دئے۔ پردھان منتری کے آتمیہ سچو (आत्मीय सचिव) میں پہلے سے جانتا تھا، اُن سے پنچ ورشیہ یوجنا (पंच वर्षीय योजना) پر بڑی دیر تک بات چیت ہوتی رہی، میں نے وہ کاریالیہ بھی دیکھا، جہاں آیات نریات (आयात निर्यात) کا انو گیا پتر (अनुज्ञा पत्र) دیا جاتا ہے، پھر دیاوہار، دنڈ، جلا، فیڈرل، راجسو، اُچ اور اُچتم نیایالیہ (व्यवहार

उच्चतम, और, उच्च, राजस्व, फेड्रल, जिला, द

اور صدر جمہوریت، سپہ سالار، امیر البحر اور ہوائی سپہ سالار بھی موجود تھے اور سب رسم پرچم کشائی کا انتظار کر رہے تھے، اتنے میں وزیر اعظم آگے بڑھے اور انھوں نے اس رسم کو بڑی شان سے پورا کیا، اُس وقت ہر ایک شخص کا دل قومی فخر سے بھرا ہوا تھا، اس رسم کے ختم ہونے پر سب وہاں سے لوٹ کر اپنے اپنے گھروں کو چلدئے اور میں بھی دہلی شہر میں گھومنے پھرنے لگا، میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹا بڑا راستہ قومی جھنڈوں سے سجا ہوا تھا۔ دوسرے دن میں نے سوچا کہ دہلی ایک تاریخی شہر ہے یہاں کے آثار قدیمہ کے دیکھے بغیر نہیں جانا چاہئے میں دن بھر تاریخی یادگاروں کو دیکھتا رہا، میرے تیسرے دن کا پروگرام یہ تھا کہ سرکاری دفتروں کو اور سکریٹریٹ کو دیکھوں، پہلے میں ریڈیو کی نشرگاہ دیکھنے گیا وہاں مختلف زبانوں کے بولنے والوں سے میری ملاقات ہوئی، جو غیر ملکی زبانوں میں اپنا اپنا پروگرام نشر کرتے ہیں، میں نے ریڈیو کے ہر شعبہ کو دیکھا، مجھے آفیسر تشخیص ٹیکس سے ملنا تھا اُن سے ملنے کے بعد تجارت، تعلیم، تعمیر، ترقیات، امور خارجہ، امور داخلہ، فنانس، لیبر، دفاع، خوراک اور رسل و رسایل کے وزیروں کے دفاتر دیکھے، وزیروں کے سکریٹری بھی اِدھر اُدھر پھرتے دکھائی دئے۔ وزیر اعظم کے پرائیویٹ سکریٹری کو میں پہلے سے جانتا تھا اُن سے پنج سالہ منصوبہ پر بڑی دیر تک بات چیت ہوتی رہی، میں نے وہ دفتر بھی دیکھا جہاں درآمد و برآمد کا لائسنس دیا جاتا ہے۔ پھر دیوانی، فوجداری، ضلع، فیڈرل، ریونیو کی عدالتیں، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دیکھنے گیا۔

(न्यायालय)) دیکھنے گیا۔ مکھیہ نیای دھی پتی (मुख्य न्यायाधिपति) اور نیترک مہالیکھا پریکشک (नियन्त्रक महालेखा परीक्षक) سے میں ملنا چاہتا تھا، پرنتو اُن دونوں کا استھانا نتر (स्थानान्तरण) ہوگیا تھا، اس لئے بھینٹ نہ ہوسکی، وانجیہ منڈل (वाणिज्य मण्डल) کے کاریالیہ کو بھی میں دیکھنا چاہتا تھا، پرنتو سمے نہ ملنے سے وہاں نہ جا سکا۔

اب میں اپنے آواس گرہ لوٹ آیا، میں بہت پرسن (प्रसन्न) تھا کیونکہ اب میں کسی ودیشی راشٹر کا داس نہیں ہوں، اپیتو (अपितु) اب گرو سے کہتا ہوں کہ میں سوتنتر بھارت کا سوتنتر ناگرک ہوں، اور میری ماتر بھومی (मातृभूमि) اب سمپورنڑ۔ پربھتو سمپن لوک تنتراتمک گنڑ راجیہ ——

सम्पूर्ण - प्रभुत्व-सम्पन्न लोकतन्त्रात्मक गणराज्य

بن گئی ہے۔

میں نے اپنے گھر لوٹنے کے لئے سمیان استھان پربندھک (संयान-स्थान प्रबंधक) سے دور بھاش دوارا اپنا استھان رکشت (रक्षित) کرنے کے لئے بات پرنتو ابھاگیہ وش (अभाग्यवश) سپھلتا نہیں ہوئی۔ اس لئے میں وایویان (वायुयान) دوار اپنے گھر لوٹ آیا۔

میں چیف جسٹس اور کنٹرولر و آڈیٹر جنرل سے ملنا چاہتا تھا، لیکن اُن دونوں کا تبادلہ ہوگیا تھا اس لئے ملاقات نہ ہوسکی، ایوانِ تجارت کے دفتر کو بھی میں دیکھنا چاہتا لیکن وقت نہ ملنے کی وجہ سے وہاں نہ جا سکا۔

اب میں اپنے ہوٹل لوٹ آیا، میں بہت خوش تھا کیونکہ اب میں کسی غیرملکی قوم کا غلام نہیں ہوں بلکہ اب فخر سے کہتا ہوں کہ میں آزاد بھارت کا آزاد شہری ہوں اور میری مادرِ وطن اب جمہوری حکومت بن گئی ہے —

میں نے اپنے گھر لوٹنے کے لئے اسٹیشن ماسٹر سے ٹیلیفون کے ذریعہ اپنی سیٹ ریزرو کرنے کرنے کے لئے بات کی لیکن بدقسمتی سے کامیابی نہیں ہوئی اس لئے میں ہوائی جہاز کے ذریعہ اپنے گھر لوٹ آیا۔

تاریخ و تذکرہ

تاریخ ڈھاکہ ۔۔۔۔ عبدالرحمٰن طپش ۔۔۔۔ ہے/
تاریخ اندور ۔۔۔۔۔ امیر احمد علوی ۔۔۔ عہ/
راجپوت اور مغل زن و شو کی معاشرت ۔ مقبول احمد ہے ۱۲/
مجاہدین مراقش (مصور) عبدالقیوم ۔۔۔۔ ۶/ ۸/
مرقع سلاطین مصور ۔۔۔۔۔۔۔۔ عہ/
عرب اور ان کا مستقبل ۔۔۔۔ مقبول احمد ۔۔۔ ۶/
تاریخ امریکہ ۔۔۔۔ یحییٰ تنہا ۔۔۔۔ سے/
تاریخ مغربی یوروپ ۔۔۔ " ۔۔۔۔ ہے ۸/
تاریخ مصر ۔۔۔ ابوالحسن ۔۔۔۔ للعہ/
تاریخ حیدر آباد ۔۔۔۔۔۔۔ سے/
تاریخ اودھ کامل ۔۔۔۔۔۔۔۔ عہ/
تاریخ جونا گڈھ ۔۔۔۔۔۔۔۔ مہ/
قدیم ہنرمندان اودھ ۔۔۔ اسرار حسین ۔۔۔۔ ۶/
تذکرۂ کاملان رامپور ۔۔۔۔ احمد علی شوق ۔۔۔۔ صہ/
" مشاہیر کاکوری نقی حیدر علوی ۔۔۔۔ للعہ/
" آب بقا عشرت لکھنوی ۔۔۔۔ ۶/
" ہندو شعرا " ۔۔۔۔۔۔ عہ/
" تذکرہ شیخ عبدالحق محدث ۔۔ سید احمد قادری ۔۔۔۔ ہے ۸/
" تذکرہ خاندان چشتیہ ۔۔۔۔۔ ۶/ ۸/
" شاب سے پہلے مرتبہ شیدا ۔۔۔۔۔ للعہ ۸/

ملنے کا پتہ :۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

"گاہے گاہے باز خواں ــــــ"

نظریۂ اسلام میری نظر میں

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں ہے جیسی آج کل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس نے عوائد و مراسم کی بیخکنی کرکے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقتاً مسلمان وہی ہے جسکے اخلاق پاکیزہ ہوں سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام اور شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے اور چونکہ یہ غلطی صدیوں سے چلی آرہی ہے اس لئے اس کا دور ہونا آسان نہیں، تاہم چونکہ اس وقت بات آپڑی ہے اس لئے مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر روشنی ڈالوں

انسان و خدا یا خالق و مخلوق کا جس حد تک یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ خالق اور خدا کی ذات بالکل بے نیاز ہے اور انسان کی کوئی بدعنوانی، کوئی نامعقولیت، یہاں تک کہ بتوں کا پوجنا بھی اس کو کوئی مضرت نہیں پہونچا سکتا، اس کی برہمی نہ انسان کی سی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہونچتی ہے اور وہ خفا ہوجاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی امر مفید کسی سے ظاہر ہوا، اور ہم اس سے خوش ہوگئے۔

چونکہ خدا کی ذات ہمارے فلسفۂ مسرت و الم سے بلند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا پھر اس مفہوم کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے، وہ حقیقتاً ہماری بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری مضرت سے ہے۔ اسلئے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشاء صرف یہی ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدبیر اختیار کرے جیسا کہ "اِن ارید الّا الاصلاح" سے ثابت ہوتا ہے اور ان مکارم اخلاق سے آپ اپنے آپ کو آراستہ کرے جو تمام نوع انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ اسی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر کفر و اسلام، شرک و توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اسلام و توحید نام ہے صرف "استقامۃ فی العمل" کا، بلندی اخلاق کا، اخوتِ عامہ کا اور کفر و شرک کہتے ہیں، نظم و نسق سے منحرف ہوجانے کو، ترک عمل کو، انحطاطِ اخلاق کو، انتشار و افتراق کو، فرقہ بندی کو، تفریق جامعۂ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔ کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چونکہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے آئے تھے اسی لئے ان کو "کافۃ للناس" ــــ اور "رحمۃ للعالمین" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ رسول نے فرقہ بندی کے خلاف اور تفریق مذاہب کے باوجود "اخوت عامہ" کے موافقت میں جو کیا یا کہا اس کا ثبوت کلام مجید سے ملتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"قل آمنّا باللہ وما اُنزل علینا وما اُنزل علیٰ ابراھیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب والاسباط
وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیوّن من ربّھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون"

پھر کیا نبیوں میں آپ رام - کرشن - بودھ - کنفوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے۔ کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہوسکتا

ہے " ولقد بعثنا فی کلّ امۃ رسولا " (ہم نے ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نبی مبعوث کیا) ارشاد خداوندی ہے۔ پھر اگر ایسا ہ تو کوئی وجہ نہیں کہ " ونحن لہٗ مسلمون " میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے۔

کلام پاک کے متعدد مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ ساری دُنیا ایک جماعت، ایک امت ہو کر زندگی بسر کرے اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں:۔

" ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولاکن یضل من یشاء و یھدی من یشاء، ولتسئلنّ عما کنتم تعملون ۵ "

" ولو شاء اللہ " کے معنی یہ نہیں ہیں کہ " اگر اللہ چاہتا " بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنادے ـــــ لیکن وہ گمراہ کردیتا ہے اس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے۔ لیکن اے لوگو تم مطمئن نہ رہو خدا تم سے ضرور باز پرس کرے گا۔ تمہارے افعال و اعمال پر وہ تم سے پوچھے گا کیوں تم نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو اختیار کیا اور کیوں تم نے اپنے عمل سے اپنی وسعت نظر سے اپنے رواداری سے اور اپنے اُصول زندگی سے اس " اخوت عامہ " کو دُنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے " یضل من یشاء و یھدی من یشآء " کے معنی بھ بعض مفسرین و مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے او ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی انھوں نے " یشاء " کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے، حالانکہ حقیقتاً " یشاء " کا فاعل " من " ہے کیونکہ آپ یہ معنی مراد نہ لیں گے تو پھر " ولتسئلن عما کنتم تعملون " بالکل بیکار ہو جائے گا۔ کیونکہ جب ہدایت و گمراہی صرف خدا داد بات ہوگئی تو باز پرس کیوں اور کس سے ؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے اور اس کی وسعت و ہمہ گیر کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

" صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ و نحن لہٗ عابدون "

یعنی اے رسول لوگوں سے کہدو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یکرنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رنگ سے بہتر کون رنگ ہو سکتا ہے، اس لئے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہ اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق و انتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ:۔

" قل یا اہل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہٖ شیئاً ولا نتخذ بعضا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانّا مسلمون "

پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوا ذات خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی اور ہستی کو اسکا مقابل سمجھا جائے۔ یہ تعلیم اس قدر سادہ، اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گمراہ سے گمراہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے اور وہ شرک و کفر یا جحود و انکار سے کیوں اس درجہ برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اس کی برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت و منفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے، انسان کا خواہ انفرادی حیثیت سے ہو اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہونچانے والا ہو جو اجتماعیت عالم کو برباد کرنے والا ہو جو مرکز انسانیت سے انحراف پیدا کرنے والا ہو، جس سے اشتراک عمل تباہ ہوتا ہو، شرک و کفر ہے، جحود و انکار ہے، بُت پ

ہے اور ہر وہ چیز جس کو غیر خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسا کرنا منشاء و حکم کے خلاف کرنا اس کی اہمیت سے انکار کرنا ہے، اس کے وجود کو نظر انداز کر دینا ہے۔ اس کی مخالفت پر آمادہ ہونا ہے۔

اسی پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کر سکتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ نہ اذان سے خدا کو فائدہ پہونچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی نقصان۔ نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت ملتی ہے نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف۔

اگر ایک شخص غیر مسلم یعنی موجودہ جماعت اسلامی کا فرد ہونے کے باوجود تمام انھیں مکارم اخلاق و محاسن فطرت سے آراستہ ہے۔ جن کی محمد نے تعلیم دی ہے تو کیا آپ اس کو صرف اس لئے کہ وہ آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہے، کافر و مشرک کہہ کر ناری و جہنمی کہدیں گے اور دوسرا شخص جو آپ کی جماعت کا فرد ہے، لیکن حد درجہ ظالم، بے رحم، مجرم اور شقی تو کیا اس کو صرف اس بناء پر کہ اس کا نام آپ ہی کی طرح ہے آپ کے اعزہ میں اس کا شمار ہوتا ہے، نجات و فردوس کا پروانہ دیدیں گے۔

ایک بے رحم قزاق قافلہ کو تباہ و برباد کر کے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کر کے فارغ ہوتا ہے کہ دفعتہً مغرب کی اذان ہوتی ہے، وہ فوراً اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبے دور کر کے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص جو تمام تمام دن دھوپ میں محنت شاق برداشت کر کے اپنے متعلقین کے لئے حلال روزی فراہم کرتا ہے۔ گاؤں کے بچوں، بوڑھوں، یتیموں اور بیواؤں کی خدمت کے لئے اپنی محنت، دولت، زندگی سب کچھ وقف کئے ہوئے ہے، لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے۔ مسجد جانے کے بجائے وہ مندر کا رخ کرتا ہے۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعی اسلام سے دریافت کیجئے۔ وہ نہایت آزادی سے بلا پس و پیش کہدے گا کہ بہر حال اس قزاق کو نجات ملنی ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس دوسرے کو آخر کار دوزخ میں جانا ہے کیونکہ اس نے بت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا۔ پھر اگر اسلام نام اسی وسعتِ نظر و انصاف کا ہے اگر "صراط مستقیم" اسی کو کہتے ہیں اگر "فامرہم بالقسط" کا یہی مفہوم ہے۔ اگر دین محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دوں گا کہ آئیے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہو جائیے کیونکہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملے گا۔

مسلمانوں کا یہ یقین کر لینا کہ صرف خدا انھیں کا ہے اور دوسری قوموں کو اس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا کیا ہے ایسا لغو و مہمل اعتقاد ہے جو کسی ذی فہم کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مایل کر سکتے ہیں اسی لئے میں نے کہا کہ جہاں تک نفس تعلیم مذہب کا تعلق ہے، مسجد و کلیسا، ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر ان دونوں جگہ مقصود خدا کی عبادت اور اصلاح اعمال ہے۔

آپ جب تک اس رواداری سے کام نہ لیں گے، جس وقت تک خیال میں یہ وسعت نہ پیدا ہوگی آپ کیونکر دوسروں سے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی جماعت میں شریک ہو جائیں گے آپ تو ناقوس کی آواز سن کر لاحول پڑھنے لگیں لیکن دوسرا آپ کی اذان کو سن کر سر بسجود ہو جائے باجہ بجانا چھوڑ دے۔ کیوں؟ آپ میں آخر وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے آپ کو خدا کا بیٹا بنا دیا ہے اور دوسرے کو گروہ شیطان و طاغوت میں داخل کر دیا، آپ کیوں خدا کی ذات کو اپنے اندر محدود سمجھتے ہیں، اس کی صفت خلق و ربانیت کو اپنے لئے کیوں مخصوص جانتے ہیں بہ حیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو، چینی ہو یا بدھ، معتزلہ ہو یا اشعریہ، ناصبی ہو یا خارجی، شیعہ ہو یا سُنی، خدا کے نزدیک ایک ہے، اس کا سب سے ایک ہی مطالبہ ہے، پھر جو اس کو پورا کرے گا خدا اسی کو ترقی و فلاح دے گا اور جو اس کو ترک کرے گا خدا بھی اس کو چھوڑ دے گا۔

بے شک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہب اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمدؐ نے پیش کیا، یقیناً بہترین ذریعہ تصفیۂ اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ہے اور اس لئے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے لیکن میں اس کی اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو بُرا کہوں جبکہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں۔

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں، اس کی طریقِ عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں، بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ اس کو نفس مقصود مذہب سے آگاہ کرکے آمادہ کریں کہ وہ اپنے طریقِ مذہب کے ساتھ ہی ساتھ مذہب اسلام کو بھی دیکھے اور خود فیصلہ کرے کہ منزلِ تک پہونچانے کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ کون سا ہے اور میری رائے میں "جادلھم بالتی ھی احسن" کا بھی یہی مفہوم ہے۔

آپ اگر اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجئے۔ یہ عام اصول اخلاق کا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قایم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اور نہ قوت و جبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہو سکتا ہے۔ تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے وضع و معاشرت میں تو تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی، دماغ کو مجبور نہیں کر سکتی ہے۔ اطمینانِ نفس، طمانیت روح، لطف و رافت، محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، جس کے ثبوت میں اسوۂ نبوی آپ کے اور ہمارے سب کے سامنے موجود ہے اور یہ چیز مسلمانوں کے پاس ایسی عظیم المرتبت، ایسی جلیل القدر ہے کہ اس کے سامنے سوا سرِ عجز جھکا دینے کے اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہے، اُسے تو آپ پیش نہیں کرتے، دکھاتے ہیں خزف ریزوں کو اور دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ انھیں کو جواہر ریزے سمجھے۔

پھر چونکہ یہ تنگ نظری نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے مقلّدین میں پائی جاتی ہے اس لئے جو اعتراض میرا اہلِ اسلام پر ہے، وہی ہندوؤں پر ہے اور وہی دوسرے مذہب والوں پر۔ نہ ہم میں رواداری، نہ ان میں انصاف، نہ ہم صراطِ مستقیم پر، نہ وہ راہِ راست پر، منزل سے بعید ہونے میں سب کا ایک درجہ ہے اور گمراہی میں مبتلا ہونے کے لئے سب یکساں طور پر حریص ہیں۔

یہ ہے میرا اعتقاد و یقین مذہب کے متعلق جسے میں نے صاف صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا اور اگر متقدمین کی تعلیم اس کی منافی ہے تو میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں، جس طرح میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ میرے قول کو صحیح سمجھ لیں لیکن اگر موجودہ حالت قایم رہی اور رہے گی تو باور کیجئے کہ ایک زمانہ آئے گا جب تمام مذاہب محو ہو جائیں گے اور وہی وقت تجدید اسلام و احیاء دین محمدی کا ہوگا۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

مالہ وماعلیہ

جوشؔ، جگرؔ، سیمابؔ وغیرہ بڑے مشہور شاعر ہیں لیکن کبھی کبھی وہ بھی ایسی فاش غلطیاں کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے حضرت نیاز نے انھیں مشہور شاعروں کی بعض نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ فنِ شعر کتنا نازک فن ہے اور بڑے سے بڑا شاعر بھی کبھی نہ کبھی اس میدان میں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ سرورق رنگین۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار لکھنؤ

جنگ اور جاسوسی

جس وقت دو فریق مقابلہ میں ہوتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو شکست دینے کا آرزو مند ہوتا ہے تو پھر اس وقت تمام قوائے انسانی اور تمام ادراکات نفس صرف ایک خیال کی طرف مایل ہوجاتے ہیں اور وہ خیال اپنی کامیابی کا ہوتا ہے، پھر چونکہ یہ بالکل فطرت کا اقتضا ہے، اس لئے غالباً یہ کہنا درست نہ ہوگا، کہ عہدِ بدویت میں بھی وہی تمام ذرائع کامیابی کے اختیار کئے جاتے ہوں گے جو اس وقت نظر آتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ اُس وقت علم وحکمت کی ترقی نہ تھی، اس لئے یہ تدابیر ناقص، بھدی اور غیر مکمل ہوتی ہوں گی، اس وقت "ذہنیات وعقلیات" کی ترقی نے اور تمام علوم وفنون کے ساتھ فنِ حرب کو بھی درجۂ کمال تک پہونچا دیا ہے اور اب زیادہ کامیابی کے ساتھ تدابیر کو بروئے کار لاسکتے ہیں۔

منجملہ دیگر تدابیر کے جو عہدِ حاضر میں جنگ کو کامیاب بنانے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں، ایک تدبیر جاسوسی کی بھی ہے جس کا تعلق جارحانہ ومدافعانہ دونوں پہلوؤں سے ہے، دشمن کی تدابیر معلوم کرنا اور اپنے حالات کو پوشیدہ رکھنا، جنگ کا اولین فرض ہے اور پھر چونکہ علم کی ترقی نے راز کو پوشیدہ رکھنے کے لئے ہزاروں حیلے اور بہانے پیدا کردئے ہیں، اسی طرح اسکو پوشیدہ اور افشاء سے محفوظ رکھنے کے لئے ویسی ہی احتیاطیں عمل میں لائی جاتی ہیں۔

گزشتہ جنگ کی اگر کوئی تاریخ کبھی لکھی گئی تو اس کے نمایاں ابواب میں سے ایک باب جاسوسی کا بھی ہوگا، جس نے بعض اوقات بساطِ جنگ پر مہروں کا رُخ بدل دیا اور بعض اوقات بڑی بڑی مصیبتوں کو دور کردیا، ہر چند یورپ کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں کے جاسوس دُنیا میں نہ پھیل گئے ہوں، لیکن جرمنی نے جس قدر وسیع پیمانہ پر اس سے کام لیا اور تفتیش وتحقیق میں جو احتیاط اس کی طرف سے ظاہر ہوئی وہ مخصوص طور پر ظاہر ہوئی، وہ مخصوص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

جو ممالک باہم برسرِ پیکار تھے، وہاں کے باشندے تو خیر کسی طرح دشمن کے ملک میں جا ہی نہیں سکتے تھے اور جو پہلے سے موجود بھی تھے وہ مقید کرلئے گئے تھے، لیکن غیر جانبدار ملکوں کے رہنے والے بھی نہایت مشکل سے پہونچ سکتے تھے جس کا اندازہ ان کے بیانات سے ہوتا ہے۔ ایک سیاح نے لکھا ہے کہ "ہر شخص نہیں سمجھ سکتا کہ اہلِ جرمنی کے نزدیک تفتیش کا مفہوم دورانِ جنگ میں کیا تھا۔ میں جس وقت ہربستال کے اسٹیشن پہ اُترا، تو مجھے ایک چھوٹے سے کمرہ میں لے گئے اس حال میں کہ سپاہیوں کا ایک دستہ مع اپنے کپتان کے مجھے گھیرے ہوئے تھا تاکہ میرے خلوص نیت کا امتحان کرے، چنانچہ خود کپتان نے میری تلاشی لینی شروع کی، اس نے میری جیبیں، کپڑے، استر، کاغذات، پاسپورٹ اور ایک ایک چیز جو میرے پاس تھی نہایت غور سے دیکھا اور اس کے بعد حکم دیا کہ جسم برہنہ کردیا جائے، جب اس کی تعمیل ہوگئی تو اس نے اسپنج کا ایک ٹکڑا لیکر کسی عرق میں بھگوکر میرے سارے جسم کو تر کیا اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد غور سے دیکھنے لگا کہ کوئی پوشیدہ تحریر تو جسم پر نمایاں نہیں ہوئی، لیکن جب وہ مطمئن ہوگیا تو مجھے کپڑے پہننے کی اجازت دی۔

ایک دوسرے سیاح نے لکھا ہے کہ "جنگ جس قدر طول پکڑتی جاتی تھی، جرمنی کی تفتیش وتحقیق اسی قدر بڑھتی جاتی تھی، چنانچہ جب میں پہونچا تو میرے پاس کے تمام کاغذات لے لئے اور ان کو نہایت غور سے دیکھا اس کے بعد کسی عرق

میں ان کو ڈبویا تاکہ اگر پوشیدہ تحریر لکھی ہو تو ظاہر ہو جائے۔ پھر میری پنسل، میرا قلم لیکر اس پر غور کرتے رہے، میرے بعض ساتھیوں کے کان اور ناک کی بھی تلاشی لی گئی"۔

انگلستان کی ایک خاتون جو "ایک جنگی انجمن امداد" کی صدر تھی، پیرس گئی تاکہ یہاں سے ہالینڈ جائے، یہ وہ زمانہ تھا جب فرانسیسی فوجوں کا اجتماع ہو رہا تھا اور کوچ کے حکم کی ہر وقت توقع کی جاتی تھی، حکومت فرانس چاہتی تھی کہ اس کی خبر کسی طرح جرمنی کو نہ پہونچے، اور اُدھر جرمنی اُس کے ہر ہر راز کو معلوم کرلینے کے لئے بیتاب تھا۔

یہ خاتون ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی اور صبح و شام آتے جاتے وہاں کی خاکروب عورت کو جو فرانسیسی تھی مضمحل و ملول دیکھا کرتی تھی، لیکن چونکہ حزن و ملال اُس وقت ہر شخص کے چہرے پر نمایاں تھا اس لئے اُس خاتون نے کچھ خیال نہیں کیا سفر شروع کرنے سے ایک دن قبل وہ عورت انگریزی خاتون کے کمرے میں آئی اور بولی کہ میرا بیٹا بلجیم میں مقید ہے اور میں اس کے لئے کچھ نقد بھیجنا چاہتی ہوں۔ میں آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوئی ہوں کہ آپ امسٹرڈم کے ایک شخص کو میری امانت پہونچا دیجئے اور وہ ایک غیر جانبدار ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے اس تک پہونچا سکے گا" یہ کہکر اُس نے آنسو بہاتے ہوئے پانچ پانچ فرانک کے تین سکے نکالے اُن کو بوسہ دیا اور خاتون کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ "ایک مجبور ماں کی محبت کی طرف سے یہ ہدیہ اس کے بیٹے کو پہونچا دیجئے" خاتون اس منظر سے بہت متاثر ہوئی اور امسٹرڈم پہونچکر وہ سکے اس آدمی کو دیدئے جس کا اس نے پتہ بتایا تھا۔

یہ بات بظاہر نہایت معمولی معلوم ہوتی ہے اور اس خاتون نے بھی خیال کیا ہوگا کہ اس نے کوئی بڑا اچھا کام کیا، حالانکہ اسی واقعہ نے فرانس کے تمام تدابیر کو جرمنی پہ ظاہر کردیا اور اس کی پہلی شکست کا باعث یہی واقعہ ہوا۔ ان تینوں سکوں پر مخصوص نشانات تھے جن سے فرانسیسی فوج کی تعداد، اور سمت و تاریخ روانگی کا حال جرمنی کو معلوم ہوگیا۔

فرانس نے بھی اپنے بعض جاسوسوں کے ذریعہ سے بڑا فایدہ حاصل کیا جس کی ایک مثال ذیل میں پیش کی جاتی ہے:۔ سوئٹزرلینڈ کے بعض حصوں اور اُس کے جوار میں شہد کی مکھیاں پالنے کا بڑا رواج ہے، یہاں تک کہ اس فن کے متعلق اخبارات و رسایل بھی شایع ہوتے ہیں ایک ضعیف شخص جو سوئٹزرلینڈ کے قریب جرمنی کے ایک صوبہ میں رہتا تھا، یہی کاروبار کرتا تھا اور ایک رسالہ بھی اس فن کا شایع کرتا تھا، لیکن یہ حقیقتاً جرمنی کا بہت دشمن تھا اور جنگ ہفتاد سالہ کے بعد سے اس جوار میں صرف اس لئے مقیم تھا کہ کسی طرح جرمنی کو زک پہونچائے، اور رسالہ کا ٹائیٹل بظاہر معمولی چیز تھا، لیکن اسی میں سارا راز پنہاں تھا جس سے فرانس کی وزارت حربیہ کے مخصوص افراد واقف تھے اس شخص نے دوران جنگ میں اسی ذریعہ سے جرمنی کے بہت سے راز افشا کئے اور فرانس بہت سی مصیبتوں سے بچ گیا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو انگلستان اور امریکہ کے درمیان تاروں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی۔ یہاں کی خفیہ پولیس نے یہ معلوم کرکے تفتیش شروع کی اور ایک شخص پر اسے کچھ شبہ پیدا ہوا، لیکن اس کے تاروں میں بظاہر کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جس کی گرفت ہوسکتی، یا جس سے کوئی حال معلوم ہوسکتا۔ ایک مرتبہ اس آدمی نے کسی شخص کے پاس امریکہ میں تار بھیجا کہ "DIED FATHER" (باپ مرگیا) اتفاق سے یہ تار قبل روانگی مُراقب (سنسر) کے ہاتھ پڑ گیا اس نے بجائے DIED (مرگیا) کے EXPIRED ("گزر گیا") لکھدیا اور تار کی روانگی کی اجازت دیدی۔ تھوڑے

کے بعد اس کا جواب آیا کہ "باپ مرگیا یا گزر گیا" اور اس طرح پولیس کو اس جاسوس کا حال معلوم ہوگیا اور اُسے ر کرلیا۔

امریکہ کا ایک نوجوان اہلِ ثروت فرانسیسی محکمۂ طیران (ہوائی) میں داخل ہوگیا اور اس کی بہن نے صلیبِ احمر سی اسپتال میں اپنی خدمات وقف کردیں، چند دن کے بعد اس خاتون کو بھی محکمۂ طیران میں داخل ہونے کا شوق ہوا لیکن عورت ہونے کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکتی تھی۔

ایک شام کو اس کا بھائی آیا اور کہا کہ جرمنی کی فوج نے اُس مکان پر قبضہ کرلیا ہے جس میں ہم تم رہتے تھے اور کو ذخیرۂ رسد بنایا ہے" یہ سنتے ہی وہ بولی کہ "آؤ اس میں آگ لگادیں" اس نے پوچھا یہ کیونکر ممکن ہے؟" وہ بولی تم اپنے ہوائی جہاز میں مجھے وہاں لے چلو اور کچھ اِدھر اتار دو، میں مزدوروں کے لباس میں وہاں جاکر آگ لگادونگی بہت صبح اپنا ہوائی جہاز لیکر آجانا میں پھر واپس آجاؤں گی۔"

ایک دن جب ابر بہت کثیف تھا، اس پر عمل کیا گیا اور وہ آگ لگانے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن آگ زیادہ مشتعل ئی تھی کہ بجھادی گئی، اب اس کی فکر ہوئی کہ آگ کا سبب دریافت کیا جائے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایک مزدورنی لیکر شراب کی بوتلیں لینے یہاں آئی تھی اور اسی کی شمع سے یہ آگ لگی ہے، چنانچہ یہ بلائی گئی اور دریافت کیا گیا، نے جواب دیا کہ "شمع سے مکڑی کے جالے مشتعل ہوگئے اور ان سے آگ پھیل گئی۔"

جب فوج کے سردار نے جو ہنگری کا رہنے والا تھا اور آسٹریا کی فوج کے ساتھ آیا تھا، اس بات کو سنا تو فوراً ں گیا اور تھوڑی دیر میں مکڑی کا جالا لئے ہوئے آیا اور بولا کہ "یہ قصہ جھوٹ ہے کیونکہ جالا شعلہ کو قبول نہیں کرتا" فراس نے شمع کے اوپر جالا رکھا اور اُس پر بالکل کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے سپاہیوں کو رخصت کرکے "میں خود اس معاملہ کی جانچ کروں گا" جب سب چلے گئے تو اس نے اُس عورت سے کہا کہ "میں تمھیں آزاد کرتا ہوں یہ تو بتاؤ کہ تم فرانسیسی حدود کے اندر واپس جانے کی توقع کیسے کرتی ہو؟"

اس نے جواب دیا کہ "میرے ساتھ اس میدان میں آئیے جو اس مکان کے جنوب میں واقع ہے۔"

افسر اس کے ساتھ چلا اس حال میں کہ پیچھے پیچھے تین سپاہی چلے آرہے تھے، اس مقام پر پہونچکر وہ کھڑا ہوگیا وہ خاتون ڈری کہ یقیناً یہاں مجھے گولی سے مار دیا جائے گا۔ اور پھر میرے بھائی کی بھی خیر نہیں۔ لیکن افسر نے اس سے کہا تم فرانس کی رہنے والی نہیں ہو، بلکہ تمھارا وطن امریکہ میں ہے، میں نے تم کو تمھارے بھائی کے ساتھ کرلسباد میں دیکھا تھا، اس لئے تمھارے لئے یہ عذر بھی نہیں کہ وطن پرستی کے خیال سے فرانس کی مدد کرو، میں بھی جرمن ہوں اور اس لئے تمھیں رہا کرتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ تم یہاں سے سیدھی امریکہ جاؤ اور یہاں کی کوئی خبر کسی کو نچاؤ۔

خاتون نے اس کا وعدہ کیا اور ایک گھنٹہ کے بعد جب اس کا بھائی آیا تو اس کے ساتھ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر چلی گئی وہاں پہونچ کر اس نے کوئی بات کسی سے نہیں کی اور سیدھی پیرس پہونچکر وہاں سے امریکہ چلی گئی۔

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی کیا حقیقت ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔
اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔
منیجر نگار

دوست

حلقۂ احباب میں ہیں بھیڑئے بھی ناگ بھی
لالہ و گل بھی ہیں گلشن میں دہکتی آگ بھی
ہمرہانِ شوق کچھ معصوم کچھ چالاک ہیں
یعنی کچھ عیسیٰ نفس ہیں اور کچھ ضحاک ہیں
ایک ہی جادہ پہ ہیں زردار بھی دہقاں بھی آج
ایک ہی منزل پہ ہیں ابلیس بھی انساں بھی آج
چڑھ رہا ہے آج ہر پیتل پہ اک چاندی کا خول،
اللہ اللہ کنکروں کے ساتھ یہ ہیروں کا تول
یہ تخاطب کی سجاوٹ یہ تکلم کا سنگار،
سادگی کے حلق پر آداب کے خنجر کی دھار
آہ یہ لہجوں کا مرہم آہ یہ لفظوں کے گھاؤ
ہر قدم پر اک گلستاں ہر قدم پر اک الاؤ
قدسیوں کی انجمن میں اہرمن زادے بھی ہیں
نور کی وادی میں لاکھوں آگ کے جادے بھی ہیں

ساغرِ زم زم میں بھر کر زہر بھی دیتا ہے وقت
ایک ہی شیشے سے دونوں کام اب لیتا ہے وقت

ساقیؔ جاوید بی۔

نقوشِ مانیؔ :-

اندوہ کش طوفانِ بلا ساحل سے بھی گھبراتا ہے
اللہ یہ منزل کون سی ہے، امید سے جی گھبراتا ہے
نازک تو ہے یارب وہ لیکن اب ختم ہو قصۂ تیغ و گلو
میں بھی جاں سے عاجز ہوں اور قاتل بھی گھبراتا ہے
تقدیرِ محبت ہی یہ ہے، بیتابیِ دل کو کیا کہیے
ہنس بول کے تم نے تسلی دی کم بخت اب بھی گھبراتا ہے
ظاہر ہے کہ چارہ ہی کیا، اُس دل کا مٹنا لکھا ہے
جس کو نگہِ دل جو سے تری تسکیں نہ ملی گھبراتا ہے
فرقت میں تصور سے تیرے کیا جانئے دل بہلے کہ نہیں
اس وقت تو نامِ ہجر نہ لے، اس نام سے جی گھبراتا ہے

یہ میرا جنوں ہے یا اُن کا نیرنگِ نظر ہے اے مانیؔ
وہ جلوہ نما ہیں پھر بھی کبھی دل خوش ہو، کبھی گھبراتا ہے

ندر علی وجد :-

آج دیوانے بھٹک جائیں نہ منزل کے قریب   آرہی ہے تری آوازِ قدم دل کے قریب
ناقصوں ہی نے سکھائے مجھے آدابِ نظر   بھول کر بھی نہ گیا میں کسی کامل کے قریب
طرفہ نیرنگ ہے پرسوز نوا سنجی کا   بوئے گل پھیل گئی کنجِ عنادل کے قریب
وجد عالم تھا عجب حُسن کی حیرانی کا
میں نے دستک جو نہ دی پردۂ محمل کے قریب

سوز جب دل میں اُتر آتا ہے،   نغمہ آنکھو سے نظر آتا ہے
مسکراتا ہے گلستانِ حیات   جب کوئی تفتہ جگر آتا ہے
وہ مرا خواب میں آنے والا   نہیں آتا ہے مگر آتا ہے
وجد اب آنکھ نہ لگ جائے کہیں
کوئی ہمراہِ سحر آتا ہے

ما جالندھری :-

طوفاں کی زد میں آئے تو ہم پر کھُلا یہ راز   آغوشِ موج میں بھی ہیں ساحل جگہ جگہ
دل میں اُٹھ کر دب گئی کچھ اس طرح موجِ نشاط   جام میں جیسے مئے گلگوں چھلک جانے کے بعد
حُسن نے ایک اچٹتی ہی نظر ڈالی تھی   آج تک عالمِ حیرت میں ہے دیوانۂ عشق
ست ہیں اپنے ہی عالم میں ترے دیوانے   جنتِ عشرتِ سرمد ہے کہ ویرانۂ عشق
میں پرسشِ پنہاں کے اِس انداز پہ قرباں   معصوم نگاہوں میں وہ مبہم سے اشارے
وہ میکدۂ شوق وہ یارانِ قدح نوش   پھرتے ہیں نگاہوں میں ابھی تک وہ نظارے
حیران ہوں خود میری سمجھ میں نہیں آتا   کس طرح غمِ ہجر کے دن میں نے گزارے

یاد رفتگان

کلام آزاد انصاری مرحوم :-

ظاہر ہے کہ بیکس ہوں، ثابت ہے کہ بے بس ہوں   جو ظلم ہوا ہوگا برداشت کیا ہوگا،
بیدل بھی ہوں، شاداں بھی، شاکی بھی ہوں، نازاں بھی   جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا،

نامِ خدا جدھر گئے، دل میں اُتر اُتر گئے   خنجر آبدار ہو، دشنۂ تابدار ہو،

امید سو وہ مفقود، ارمان سو وہ محروم   اے وائے دل محروم، صد وائے دلِ محروم
اب دل کی نہ کچھ پوچھو، اب دل کا خدا حافظ   مایوس نہ کچھ مایوس، مسرور نہ کچھ مغموم

آپ نے درد سن لیا ہوتا   درد کی کچھ دوا نہیں نہ سہی
ترک حاجت بھی ممکنات سے ہے   کوئی حاجت روا نہیں نہ سہی

آہ مجھ سے مرے ارمان بھرے دل کے سکوں   وہ بھی دن ہوں گے کہ ارمان نہ ہوگا کوئی

اے کاش خبر ہوتی تو دل سے بھلا دے گا   اے کاش سمجھ سکتے تو مل کے دغا دے گا
تم جبر کئے جاؤ ہم صبر کئے جائیں   اللہ تو منصف ہے، اللہ جزا دے گا
آزاد گدا مشرب دنیا سے غرض مطلب   کوئی ہمیں کیا دے گا، دے گا تو خدا دے گا

تو اور چشم لطف نئی واردات ہے   میری نگاہ نے مجھے دھوکا دیا نہ ہو

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے، امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے
قرار نام کی ساعت قریب آپہونچی   کسی کی یاد ذرا اور بے قرار کرے
خدا کے واسطے آ اور اس سے پہلے آ   کہ پاس چارہ تکلف انتظار کرے

دل اور ترے خیال سے راحت نہ پاسکے   شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی
اک پائمال جور سے امید شکرِ جور،   جا شکر کر، کہ تابِ شکایت نہیں رہی

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جنچتا،   تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

کتوبات نیاز

(تین حصوں میں)
یڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو
جذبات نگاری، سلاست بیان
ینی اور البیلے پن کے لحاظ
ے فن انشا میں بالکل پہلی
یز ہیں اور جن کے سامنے
طوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے
ب ان اڈیشنوں میں پہلے
یشن کی غلطیوں کو دور کر دیا
یا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر
باعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ
چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر
افسانہ جو اردو زبان میں
بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری
کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی
زبان و تخیل اسکی نزاکت
بیان اسکی بلندی مضمون
اور اسکی انشاء عالیہ سحر
حلال کے درجہ تک پہونچی
ہے۔ یہ اڈیشن نہایت
صحیح اور خوشخط ہے
قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ
تمہید کے ساتھ بہترین
ہندی شاعری کے نمونے
پیش کر کے ان کی ایسی
تشریح کی ہے کہ دل بیتاب
ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہ سب
سے پہلی کتاب اس موضوع
پر لکھی گئی ہے جس میں
ہندی شاعری کے بے مثل
نمونے نظر آتے ہیں۔
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فلاسفہ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز
کے دو علمی مضامین
شامل ہیں:-
(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم
کی روحوں کے ساتھ
(۲) مادیین کا مذہب
نہایت مفید و دلچسپ
کتاب ہے۔
قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب
کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق
کی تمام نشہ بخش کیفیات
اسکے ایک ایک جملہ میں موجود
ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ
اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر
بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ
اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔
تازہ اڈیشن نہایت صحیح و
خوشخط، سرورق رنگین
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

راست الید

لفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے
طالعہ سے ایک شخص انسانی
ت کی شناخت اور اس
، لکیروں کو دیکھ کر
نے یا دوسرے شخص کے
ستقبل، سیرت و عروج
زوال، موت و حیات
حت و بیماری، شہرت و
نامی پر صحیح پیشین گوئی
ر سکتا ہے۔
مت ایک روپیہ
علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا
مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے
کہ ہمارے ملک کے ہادیان
طریقت و علمائے کرام کی
اندرونی زندگی کیا ہے اور
ان کا وجود ہماری معاشرت
اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ
سم قاتل ہے۔ زبان، پلاٹ و
انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ
ان افسانوں کا ہے وہ صرف
دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے
قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری
جو ادبیات و تنقید عالیہ کا
عجیب و غریب ذخیرہ ہے
ایک بار اس کو شروع کر دیا
آخر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی
جدید اڈیشن ہے جس میں
صحت اور نفاست کاغذ
و طباعت کا خاص اہتمام
کیا گیا ہے۔
قیمت
ایک روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات
کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے
ایران و ہندوستان کا اثر جرمن
شاعری پر فارسی زبان کی
پیدائش پر مورخانہ نظر اردو
شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو
غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی
نقش ہائے رنگ رنگ غالب
کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ
ادبیات اور اصول نقد
فنون ادب، حقیقت نگاری
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ
معرکۃ الآرا مقالہ جس میں
انہوں نے بتایا ہے کہ
مذہب کی حقیقت کیا
ہے اور دنیا میں یہ کیونکر
رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ
کے بعد انسان خود فیصلہ
کر سکتا ہے کہ مذہب کی
پابندی کیا معنی رکھتی ہے
قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ سنہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری - مارچ

سنہ ۱۹۴۶ء

جو نقادانِ ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈس کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ (اقتباس) ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ سنہ ۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقادوں نے حصہ لیا ہے۔ اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، قیام حیدرآباد، زمانہ کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور انکے فن شعر گوئی پر بھی ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت دو